ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

ایک ذرا سی بارش

پرکاش فکری

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

ایک ذرا سی بارش

پرکاش فکری

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب : ایک ذرا سی بارش

نام مصنف : ظہیر الحق

قلمی نام : پرکاش فکری

پتہ : پراس ٹولی، ڈورنڈہ، رانچی - ۸۳۴۰۰۲، انڈیا،

فون ۲-۲۵۰۶۶۷۲-۶۵۱ (۰۰۹۱)، ای میل : prakashfikri@hotmail.com

سرورق : ہن گانگ، فلپنس

سال اشاعت : ۲۰۰۴ء

کتابت : علیم اللہ صدیقی، کلکتہ

زیر اہتمام : رزینہ تنویر

قیمت (ہندوستان میں) : ۲۵۰ / روپے

(بیرون ممالک) : ۱۰ / امریکی ڈالر

ناشر :

سن فلاور پبلشنگ

SUNFLOWER PUBLISHING

84, Masjid Road, Dhatkidih, Jamshedpur- 831 001, India

Phone: (0091) 657-2407312 / 657-2220516 / 651-2506672

E-mail: sunflowerindia@hotmail.com

اپنی ننھی نواسی

اور

اپنی نو بیٹیوں کی جان

غزأت تعبیر

یعنی گیرٹی کے لیے

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

ہونٹ کا سایا ہے دیکھو ریشمی رخسار پر
انگلیوں کا لمس رقصاں جسم کی دیوار پر

کل تلک لپٹی تھیں جن سے خامشی کی ناگنیں
ہیں پرندوں کے بسیرے اب انہی اشجار پر

آؤ چھپ کے بیٹھ جائیں وقت کی دھڑکن گنیں
برف گہری ہو رہی ہے سبزہ و کہسار پر

شام ہوتے ہی اندھیرا گھیر لیتا ہے ہمیں
پھیر دیتا ہے اداسی رونق بازار پر

بہتے دریا سے بھلا کیا دوستی فکری کرے
عمر بھر چلنا جسے ہو آگ کی تلوار پر

کالی راتوں میں فصیلِ درد اونچی ہو گئی
اندھی گلیوں میں خموشی لاش بن کے سو گئی

برف سے ٹھنڈے اندھیروں کی سسکتی گود میں
مرتے لمحوں کی اُداسی دل میں کانٹے بو گئی

شہر کی سونی چھتیں ہوں یا فسردہ راستے
قطرہ قطرہ گرتی شبنم سب کا چہرہ دھو گئی

نیند میں ڈوبے شجر سے چیختے پنچھی اڑے
خوف کے مارے ہوائیں کپکپی سی ہو گئی

اس اکیلے پن کے ہاتھوں ہم تو فکری مر گئے
وہ صدا جو ڈھونڈتی تھی جنگلوں میں کھو گئی

چاندنی کو چھو کے دیکھیں دھوپ کا نشّہ پئیں
خبط ہے سایوں کو چومیں راز سب کے جان لیں

زرد موسم کی ہواؤ! کاش اتنا کر سکو
شبد کی پرتوں میں اُترو تاکہ تم کو پا سکیں

کیوں بیاباں میں کھڑے ان بولتے اجڑے شجر
پیاس کی سوکھی زباں سے ابر کا قصہ سنیں

ذرے ذرے کو ملا کر جب بنایا آئینہ
آنکھ اپنی کھو چکے ہیں، آئینے کو کیا کریں

حال ابتر ہو گیا ہے راستوں کی دھول میں
آؤ نکہتی! اس ندی میں ہاتھ منہ دھوتے چلیں

اپنے چہرے سے نمی یہ آنسوؤں کی پونچھ لو
یہ تماشہ دیکھنے کو سامنے تو کوئی ہو

زخم خوردہ کچھ صدائیں آ ہی جائیں گی یہاں
خامُشی سے ڈر گئے تو کھڑکیوں کو کھول دو

غم بھری آنکھوں سے مجھ کو دیکھتا ہے روز کیوں
کچھ تو اپنا طور بدلے آئینے سے یہ کہو

ٹوٹتے یہ جسم سارے بےکسی کے بوجھ سے
کیوں لئے پھرتے ہو ان کو شہر کے اے راستو

ذات کے اندھے مکاں میں قید ہو فکری اگر
گھر کے یادوں میں رہو اور عمر بھر تنہا جلو

اے ابرِ نامراد ذرا دیر تو ٹھہر
تیرے سہارے کاٹ لوں یہ دھوپ کا سفر

خاموشیوں کی ریت سے یہ جھیل بھر گئی
اترے تھے کچھ پرند وہ جاتے ہیں لوٹ کر

سورج پگھل کے شام کے ساحل پہ بہہ گیا
سائے سے اب یہ پوچھ کہ وہ جائے گا کدھر

اب بھی کھڑے ہیں دیکھ لے جنگل ہرے بھرے
چہرہ یہ تیرے شہر کا لیکن گیا اتر

فکری اسے پکار کہ وہ شخص سو گیا
بن کے صدا تو راہ سے اس کی کبھی گذر

بستر پر یوں لیٹے لیٹے آخر کس کی راہ تکوں
چپکے سے دروازہ کھولوں سناٹوں کی بات سنوں

جو کچھ مجھ پر بیت چکی ہے کاغذ پر کیا کردوں رقم
یاد کے پیڑ سے ٹپکے پھل کا سبز کسیلا زہر پیوں

کس نے لکھا یہ افسانہ میرے حال سے ملتا ہے
بتی کی لو اونچی کر کے اس کو پھر اک بار پڑھوں

میلے دُھندے شیشے میں تصویر ٹنگی ہے برسوں سے
رات مجھے احساس ہوا کہ اس میں قید تو میں ہی ہوں

مجھ سے وہ انکار کرے پھر اتنا کچھ آسان نہیں
ذرّہ بن کے اک دن نکھری آنکھ میں اسکی ڈوب رہوں

اپنے ملبوس کے رنگوں میں اُداسی نہ چھُپا
سرد ہونٹوں پہ جمی برف کو اب تو پگھلا

جو دھڑکتا تھا مرے دل میں تمنّا بن کر
اس کو دیکھا تو عجب رنج کا احساس ہوا

پھول زخمی تو ہوئے پھر بھی وہ چپ چاپ رہے
سختیٔ سنگ سے گُل دان مگر چیخ پڑا

اپنی تصویر کے نیچے یہ عبارت لکھ دوں
زرد دیوار کی آغوش میں کالا سایا

رات اُتری ہے ہر اک سمت اندھیرا لے کر
دن کے آنے میں ابھی دیر ہے فکری سُو جا

غیر کی آنکھوں سے دیکھوں تو سبھی اچھّا لگے
اپنی آنکھوں سے مگر کچھ اور ہی نقشا لگے

خواہشوں کا خون پی کر جسم کالا پڑ گیا
آئینہ جب بھی اٹھاؤں درد کا چہرا لگے

مجھ کو کپڑوں میں بھی دیکھا تھا کبھی اس شہر نے
یہ ہے سچا واقعہ پر آج یہ جھوٹا لگے

غم گساری تو الگ ہے کوئی سُنتا بھی نہیں
چاہتا ہوں اب لبِ فریاد پر تالا لگے

اِن اندھیرے پانیوں میں وہ جزیرہ ہے کہاں
دھوپ ہنستی ہو جہاں پر آسماں نیلا لگے

رات اس اندھی گلی میں آ کے نکڑ ہی رک گئی
چھیڑ قصے کچھ پرانے وقت تو ہلکا لگے

ٹوٹا ہوا ہوں شاخ سے بارانِ سنگ میں
اب گھُل رہا ہوں دیکھ لے مٹی کے رنگ میں

اِس دشمنی سے فائدہ تو خاص کچھ نہیں
یہ دشمنی نکال لے اک روز جنگ میں

خواہش تو راہ ڈھونڈ کر اپنی سی کر گئی
رکھا تھا قیدِ جسم کو ملبوسِ تنگ میں

پچھلے برس وہ اور تھا پر دیکھ اب اُسے
شعلہ ہے جیسے رقص میں نشہ ترنگ میں

صحرا مرا وجود ہے جب کہ ہر ایک سو
میدان سبز سبز ہیں دریا امنگ میں

فکر ہی یہ دل کا آئینہ کس کام کا رہا
گم ہو گیا وہ عکس ہی تیرہ سُرنگ میں

ٹوٹے نہ گِر کے ہاتھ سے شیشے کا یہ گلاس
سہمی اُداس خامشی بکھری ہے آس پاس

آنکھیں بچا کے دیکھ لے یہ شخص ہے وہی
شہرت ہے جس کی دہر میں لیکن ہے بے لباس

دہکا ہوا وہ جسم مجھے برف کیوں لگا
چھانے لگا ہے ذہن پہ کیا وقت کا ہراس

بہتی ندی کی موج نے چُپکے سے یہ کہا
نادان! ایک خبط ہے یہ لذّتوں کی پیاس

بنتے بگڑتے پھیلتے اِن دائروں کے بیچ
مرکز کی بس تلاش میں نکلی ہے بدحواس

ہوا سے زرد پتّے گر رہے ہیں
کتابوں کے ورق بکھرے پڑے ہیں

اِسی پانی میں مچھلی کا مکاں ہے
اِسی پانی میں پیاسے ہم مرے ہیں

جہاں گلزار کھلتا تھا ہنسی کا
وہیں چمگادڑوں کے گھونسلے ہیں

اندھیرے میں ڈرا دیتے ہیں ہم کو
یہ کپڑے کھونٹیوں پر جو ٹنگے ہیں

کبھی تو خاک میں وہ بھی ملیں گے
ابھی جو چاند سے فلکری بنے ہیں

آنکھیں کھُلیں تو دھوپ کا پہرا تھا چار سو
پیہم حادثات کا چرچا تھا چار سو

مردہ پڑے تھے لوگ گھروں کی پناہ میں
دریا وفورِ غیظ سے بپھرا تھا چار سو

کالی مہیب رات تھی سنسان تھی ڈگر
رُک رُک کے ہم نے خوف سے دیکھا تھا چار سو

پڑھ کر کسی کتاب میں اس حادثے کا ذکر
اپنا وجود ٹوٹ کے بکھرا تھا چار سو

فکری لگی تھی مہر ہواؤں کے ہونٹ پر
اُس سے بچھڑ کے آئے تو کہرا تھا چار سو

سچ مچ گذشتہ رات کا منظر مہیب تھا
وہ زرد زرد چاند بھی کتنا عجیب تھا

اک ایک کر کے وقت نے سب کچھ بدل دیا
اب وہ بہت ہی دور ہے پہلے قریب تھا

بچھڑے ہوئے وہ لوگ مجھے پھر نہ مل سکے
ڈھونڈا بہت تو سامنے اُجڑا نصیب تھا

اپنے تمام راز اُسی پر عیاں کیے
جو دوستی کی آڑ میں میرا رقیب تھا

اک حرف بھی زبان پہ اپنی نہ لا سکا
باتوں کے سب امیر تھے فکری غریب تھا

ہر آن پہاڑوں میں یہ کون بلاتا ہے
چپ چاپ اندھیروں میں آ آکے ڈراتا ہے

پانی کے خنک جھرنے پھولوں سے لدی شاخیں
ترسی ہوئی آنکھوں کو یہ خواب رُلاتا ہے

شاموں کو اُداسی کی اُڑتی ہیں ابابیلیں
راتوں کو خموشی کا آسیب ستاتا ہے

خوشبو وہ گلابوں کی لایا نہ کبھی فکری
جھونکا جو ہواؤں کا زنجیر ہلاتا ہے

خالی ہُوا مکان تو آسیب آ بسے
خاموشیوں نے چارسو جالے سے بُن دِئے

پنجر پڑے تھے دھوپ میں اونٹوں کے جسم کے
مدت ہوئی ہے قافلہ اس راہ سے گئے

پانی کا جب نگاہ سے اک جائزہ لیا
دونوں کنارے چین سے سوئے ہوئے ملے

سرما کی سرد شام میں رنگت بہار کی
اس نرم گرم شال پہ بوٹے گلاب کے

سیدھی کمر کمان سی آخر کو جُھک گئی
فکر کی خمیدہ پشت ہے اپنے ہی بوجھ سے

یہ سنگِ گراں ٹوٹ کے بکھرے تو کسی روز
برسوں کی جمی برف بھی پگھلے تو کسی روز

پانی کی نگاہوں میں کوئی خوف تو دیکھوں
ساحل پہ کوئی حشر سا اُٹھے تو کسی روز

پوچھوں گا اُڑانوں میں اسے آیا ہے کیا ہاتھ
تھک کر وہ اسی شاخ پہ اُترے تو کسی روز

جمنے جو لگی گرد سی اس شیشۂ دل پر
ہو جائیں گے یہ عکس بھی دھندلے تو کسی روز

ذرّوں میں اتر آئیں گی مہتاب کی کرنیں
فکریؔ وہ مری راہ سے گزرے تو کسی روز

نشہ تھا جتنا لہو میں شامل اتر گیا ہے
جو خواب آنکھوں میں پل رہا تھا بکھر گیا ہے

چہار جانب کھڑی ہے دیوار پر بتوں کی
مجھے سپُرد بلا وہ کر کے کدھر گیا ہے

نکل ہی پڑتا نئے جزیروں کی جستجو میں
مگر سمندر کا شور سُن کے وہ ڈر گیا ہے

کہیں ملے تو یہ بات اس سے ضرور کہنا
کہ کام اس کا وہ زہر چپکے سے کر گیا ہے

یہ خوف کس کا کہ جس کی دہشت ہے سب پہ طاری
یہ شہر کیسا جو شام ہوتے ہی مر گیا ہے

عجب سے رنگ میں یاروں کی دوستی دیکھی
پسِ نگاہ کوئی اور شئے چھپی دیکھی

گڑے ہیں پاؤں مرے خوف کے بیاباں میں
بسا تھا شہر وہیں آگ جب لگی دیکھی

یہ اس کا خط ہے کہ جس میں تھکن اداسی کی
ہر ایک لفظ کی آنکھوں سے جھانکتی دیکھی

کوئی تو رُک کے بتائے کہ ماجرا کیا ہے
دُکھوں کی گرد ہر اک شکل پر جمی دیکھی

حدودِ ذات سے آگے نکل بھی جا فکریؔ
کہ اس مقام پہ کتنوں کی گت بری دیکھی

سبز لجیلی بیلیں پھیلیں گملوں میں کچھ پھول ہنسے
سرد رُتوں کا سورج آیا خوابوں کی سوغات لئے

میرے گھر کی پچھلی سیڑھی ڈوب گئی اندھیارے میں
شور مچا کر سارے پنچھی پیڑوں میں روپوش ہوئے

جانے کس کی آہٹ پا کر کابل ٹامی چونک اٹھا
نیند سے اٹھ کر ایک گلہری خطرے کی آواز سنے

میٹھے نرم سنہرے بسکٹ طشتریوں سے چھیڑ کریں
بھیگے ہونٹ کی خوشبو جیسی چائے کے ہم نے گھونٹ بھرے

آتش دان کی گرمی پا کر بوڑھی ساعت اونگھ گئی
گزرے وقت کا لمبا سایا دیواروں پر رقص کرے

دہشت سیہ بلاؤں کی منڈلائے گی کہاں
ایسے کھنڈر کو چھوڑ کے اب جائے گی کہاں

کیوں نہ صدائے درد کو سینے میں گھونٹ دوں
پتھر کے سرد شہر میں سمائیگی کہاں

کھارے سمندروں سے ملن میں مزہ ہے کیا
ندّی کسی کو بھید یہ بتلائے گی کہاں

مارے تھکن کے چور ہوئی دشت کی ہوا
خوشبو اُڑا کے دور سے وہ لائے گی کہاں

آغاز بھی فضول سا، انجام بھی فضول
دنیا بھلا یہ داستاں دُہرائے گی کہاں

فکری تو سنگ میل نہیں جس کی راہ کا
اس راہ رو کو یاد تری آئے گی کہاں

سفر کی گرد اُتاریں نکھار لیں چہرہ
مگر ہے کون جو اِس آئینے کو دیکھے گا

گزر چکے ہیں مہ و سال قافلے بن کر
لہو کا شور رہی ہے چیختے سمندر سا

خطوں سے اُس کے محبت کی آنچ آتی تھی
ملے جو اس سے تو بالکل ہی برف جیسا تھا

تڑپ کے رہ گئی پانی کی گود میں مچھلی
سمٹ کے رہ گیا ساحل پہ جال ریشم کا

سرکتی ریت کی سیڑھی کا آسرا کیا ہے
ذرا سے نام پہ اَپنے کو بھول جائیں کیا

ٹھنی ہے نیند سے آنکھوں میں رات جلتی ہے
پڑا ہے روح پہ فکری عذاب کا سایا

سارے کئے کرائے پہ پانی نہ پھیر اب
خواہش کو دے لگام طبیعت ہے سیر اب

میرا یقین و حوصلہ کچھ اور بڑھ گیا
وہ پُر غرور شخص ہے مٹی پہ ڈھیر اب

زیر و زبر کے جس میں تعین کی بات ہے
اس سخت امتحان میں کتنی ہے دیر اب

کس کا ہے عکس کون سا اس کی نہ فکر کر
مجھ کو سمجھ کے آئینہ آنکھیں نہ پھیر اب

فکر تھی چمکتے دن میں ہزیمت کا خوف تھا
اب تو اندھیری رات ہے دشمن کو گھیر اب

تیرگی کی سیڑھیوں پر رات کو پچھلے پہر
کچھ عجب پرچھائیاں سی مجھ کو آتی ہیں نظر

لوگ اس کو دے بھی آئے خاک کی تحویل میں
گمشدہ لمحہ ہوا وہ ڈھونڈا اس کو عمر بھر

چاند کے نیلے بدن میں گرم سورج کا لہو
جیسے میرے جسم میں ہے تیری یادوں کا گذر

ڈھونڈ لینا ان دنوں مجھ کو بڑا آسان ہے
اس بھری بستی میں ہے اب ایک ہی ویران گھر

وہ کھلے میدان تک ہی کیا نصیبوں میں نہیں
کب تلک رکھیں گے آخر قید یہ دیوار و در

تتلیوں کے رنگ آخر ہم چُراتے کس طرح
بھاگتے لمحوں کے سائے ہاتھ آتے کس طرح

لوگ جبکہ اپنے اپنے دائروں میں قید تھے
صاف سیدھا راستہ ہم کو دکھاتے کس طرح

ان دنوں دریا تھے سوکھے بارشوں کی رُت نہ تھی
ریت کی لہروں پہ کشتی پھر چلاتے کس طرح

سونگھ کر خوشبو لہو کی بھیڑئیے پیچھے لگے
زخم کھایا جسم لوگو ہم بچاتے کس طرح

اپنے اندر تیرگی کا اک ہٹیلا چور تھا
روشنی کی محفلوں میں بار پاتے کس طرح

ڈال کر آنکھوں میں آنکھیں جب کیئے اس نے سوال
جھانکتے بغلیں کہاں سے سر کھجاتے کس طرح

بے لباسی کے سبب معتوب جو فکریں ہوئے
بھیک کے کپڑے بدن سے وہ لگاتے کس طرح

رنگین خواب آس کے نقشے جلا بھی دے
جاں پہ بنی ہے روشنی اس کو بجھا بھی دے

ناموس ضبط بوجھ ہے کب تک لئے پھروں
ساری امیدیں چھین کر مجھ کو رُلا بھی دے

پہنچا ہے کس کی کھوج میں حد زوال تک
گم ہو گیا ہے کون تو اس کا پتا بھی دے

بے چارگی کی رات کے غار سیاہ سے
قید سکوت توڑ کے کوئی صدا بھی دے

ہر آئینے پہ وقت کی انگلی کے داغ ہیں
مٹ جو سکیں یہ داغ تو ان کو مٹا بھی دے

اس دشت بے گیاہ میں مجبور ہوں کھڑا
منزل کا کچھ نشان دے رستہ بتا بھی دے

جس پہ رُتوں کے ہاتھ کی تحریر ہے لکھی
فکری وہ اپنے جسم کی دیوار ڈھا بھی دے

آندھیاں آتی ہیں اور پیڑ گرا کرتے ہیں
حادثے یہ تو یہاں روز ہوا کرتے ہیں

انکے دل میں بھی کوئی کھوج تو پنہاں ہوگی
یہ پرندے جو ہواؤں میں اڑا کرتے ہیں

ان اندھیروں میں کوئی راہ تو روشن ہوتی
یہ ستارے تو ہر اک رات جلا کرتے ہیں

ہار کے زخم کبھی، جیت کی لذت بھی کبھی
ہم تصور میں کئی کھیل رچا کرتے ہیں

جن کے چہروں پہ کوئی دھوپ نہ سایا کوئی
ان مکانوں میں عجب لوگ رہا کرتے ہیں

دن کے صحرا میں جسے ڈھونڈ نہ پائیں فکری
شب کے جنگل میں وہ آواز سنا کرتے ہیں

خنک ہوا کا یہ جھونکا شرار کیسے ہوا
یہ میرا شہر دُکھوں کا دیار کیسے ہوا

بجھے بجھے تھے بہت جب کہ نقش موسم کے
لہو کے رنگ کا ان پہ نکھار کیسے ہوا

بنا ہوں جس سے خطا کار سب کی آنکھوں میں
وہ جُرم مجھ سے بتا بار بار کیسے ہوا

مِلا نہ جس کو بلاوا کبھی سمندر کا
وہ شخص موجِ بلا کا شکار کیسے ہوا

بہ شکل عمر ملی بھیک جس سے لمحوں کی
وہ وقت میرے لئے بے کنار کیسے ہوا

وہ جسم جس پہ بہت ناز تھا تجھے فکری
وہ جسم دشتِ فنا کا غبار کیسے ہوا

مرگ آثار حوادث کا خطر ہے اب کے
دشت پُر ہول کی راہوں میں سفر ہے اب کے

رات آتی ہے تو روتی ہیں بلائیں ہر سو
سب کے سینوں میں اترنے کو ہے خنجر اب کے

مچھلیاں ریت پہ ساحل کی پناہیں ڈھونڈیں
کچھ عجب غیظ سے اُمڈا ہے سمندر اب کے

یہ جو موسم ہے خطرناک ارادوں والا
زخم گہرا وہ مجھے جائے گا دیکر اب کے

وہ مرے شہر اگر لوٹ کے آیا فکری
اس کو دیکھوں گا بہت ڈوب کے اندر اب کے

جنگل میں جا کے آدمی آرام سے رہے
مطلب نہ کوئی صبح سے نہ شام سے رہے

چہروں کا اُن کے رنگ ہے بس راکھ کی طرح
اُلجھے ہوئے جو خوف کے ابہام سے رہے

کس کو تھی اتنی فکر کہ پہچانتا ہمیں
ہم شہرتوں کے بیچ بھی گمنام سے رہے

ٹھوکر لگی تو پوچھ لیا سنگ کا مزاج
تاکہ اُسے بھی ربط کسی نام سے رہے

فکری غزل سے دوستی یوں تو رہی مگر
قربت کے ہم حصول میں ناکام سے رہے

آنکھ پتھر کی طرح عکس سے خالی ہو گی
خون ناحق کی مگر جسم پہ لالی ہو گی

مل کے بیٹھیں گے وہی لوگ ادھورے آدھے
پھر وہی میز وہی سرد پیالی ہو گی

ایسے موسم میں وہ چپ چاپ نظر جو آیا
اس نے آنکھوں میں کوئی شکل بسالی ہو گی

اس کو لفظوں میں اتاروں تو ورق ہوں روشن
اس کی تصویر بناؤں تو مثالی ہو گی

مل بھی جائے مری خواہش کا صلہ جو مجھ کو
روح اپنی وہی مجبور سوالی ہو گی

یار فکری یہ چمکتے ہوئے جگنو رکھ لے
رات جنگل کی ابھی اور بھی کالی ہو گی

ٹھہرے ہوئے لمحے ہیں کمرے میں اندھیرا ہے
مٹی کے کھلونوں کا اک طاق پہ ڈیرا ہے

آنگن کی اداسی میں امرود کی شاخوں پر
بھٹکی ہوئی چڑیوں کا اک رات بسیرا ہے

روشن جو امیدیں تھیں وابستہ ہوئیں اس سے
تاریکی و محرومی، حصہ یہی میرا ہے

کچھ خاص نہیں اس میں اوروں سا بھی کچھ ہے
وحشی ہیں مگر آنکھیں اور جسم چھریرا ہے

جس سمت بھی جاؤں میں وہ ساتھ رہے میرے
مانند فلک مجھ کو اس یاد نے گھیرا ہے

مت جان اسے اپنا فکری ہے کہاں کس کا
سائے کی صدا ہے وہ کہنے کو جو تیرا ہے

طوفان کی صدا سے جنگل لرز اٹھا ہے
پیڑوں کے سر پہ کوئی آسیب ناچتا ہے

شور و شغب ہے اتنا کیسے سنو گے میری
سب کو پڑی ہے اپنی یہ وقت دوسرا ہے

تھک کر ہوا تو کب کی خاموش ہو چکی ہے
اک برگ خشک لیکن رہ رہ کے کانپتا ہے

وہ دھوپ میں تمازت پلکیں جھلس گئی ہیں
اک پھول اب بھی لیکن آنکھوں میں ہنس رہا ہے

تاریک پربتوں میں سورج نے جان دیدی
ٹھنڈا اداس کہرا بستی پہ ڈولتا ہے

مشکل یہی ہے فکری اترو گے پار کیسے
کشتی ڈری ہوئی ہے دریا چڑھا ہوا ہے

اب کے برس ضرور ہی پھل لائے گی یہ شاخ
جھونکوں کی چھیڑ چھاڑ سے شرمائے گی یہ شاخ

بادل برسنے آئیں تو جھومے گی موج میں
بجلی کی تیز آنکھ سے ڈر جائے گی یہ شاخ

جھولیں گے اس پہ بیٹھ کے پنچھی بہار میں
گیتوں بھری ہواؤں میں اترائے گی یہ شاخ

جو دھوپ ریگ زار کی ہم کو جلائے گی
بن کے سہانی یاد چلی آئے گی یہ شاخ

اس کے تلے وہ آئے جو ملنے کو ادر سے
سینے پہ بن کے سانپ سی لہرائے گی یہ شاخ

دیکھے گی تجھکو وقت سدا اس کی چھاؤں میں
نکری ترے نصیب میں رہ جائے گی یہ شاخ

تیری صدا کی آس میں اک شخص روئے گا
چہرہ اندھیری رات کا اشکوں سے دھوئے گا

شعلے ستم کے لائے گی اب رات چاندنی
سورج بدن میں دھوپ کے خنجر چبھوئے گا

اے شہر نامراد! تجھے کچھ خبر بھی ہے
دریا دکھوں کے زہر کا تجھکو ڈبوئے گا

پربت گرے گا ٹوٹ کے گہری نشیب میں
کب تک جمودِ برف کا وہ بوجھ ڈھوئے گا

فکریؔ تو اپنی بات کا انداز تو بدل
ورنہ خزینہ نام کا اک روز کھوئے گا

لمحوں کی سرد سیڑھیوں پہ بیٹھ کر سدا
یادوں کے دھندلے رنگ سے تصویر مت بنا

تیرا بدن تو آگ کی روشن مثال ہے
بتی جلا کے آئینے سے پوچھتا ہے کیا

میں راستوں کی دھول میں بکھروں گا چار سو
اس شہر سے وہ اجنبی جس روز جائے گا

اب پتھروں کی قید میں روتا ہے رات دن
شیشے کے اک مکان میں جو مدتوں رہا

فکر ہی بڑے ہی چین سے رہتا ہے اندروں
اپنے تمام زخم وہ اب بھول سا گیا

آگ سینے میں نہیں درد کا طوفان نہیں
میری آنکھوں پہ کسی خواب کا احسان نہیں

اپنے آغاز کو پھر لوٹ تو جاؤں لیکن
دوریٔ وقت کو اب پاٹنا آسان نہیں

میں تو چہرے پہ کئی رنگ چڑھا کے نکلا
سخت حیرت ہے مگر آنکھ وہ حیران نہیں

اس تعلق میں کوئی چیز کہیں پر گم ہے
وہ مقابل ہے مگر شوق میں ہیجان نہیں

رات تاریک، ہوا تیز بہت ہے فکریؔ
ایسے عالم میں چلا آئے وہ امکان نہیں

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

لگتا ہے ایک خواب سا یہ رات کا سماں
چپ چاپ سی فضاؤں میں اک راز ہے نہاں

دن کی کھلی کتاب کی تحریر دیکھ کر
لَو دے اٹھیں گے یاد کے مٹتے ہوئے نشاں

ترکش میں کوئی تیر نہیں خواہشوں کا اب
تھکنے لگی ہے دوستو یہ جسم کی کماں

ہر موڑ پر جو ساتھ تھا اک دن بچھڑ گیا
سایا تھا یا کہ آدمی آخر گیا کہاں

فکر ہے کہیں زوال کے آثار تو نہیں
اندر ہے ایک شور سا اور گنگ ہے زباں

اونچے پربت بہتی ندی، نیلا ہے آکاش
بادل کے اک ٹکڑے جیسی اُجلے چاند کی قاش

چھٹی کے بے کار سے دن میں کرنا ہے کیا اُور
بیتی باتیں یاد کریں یا کھیلیں مل کر تاش

خاطر میں کیا لاتے ہم کو بھرے پُرے تھے لوگ
پاس تھا اپنے کون خزانہ سدا رہے قلّاش

دُکھ میں سُکھ میں کوئی بنتا کیسے اپنا میت
الگ تھلگ جب رکھی اپنی سب سے بود و باش

چھُپ چھُپ کر جو راس رچایا دل نے ہے اک بوجھ
شہر میں کیسے نکلیں گے جب پردہ ہو گا فاش

جو بھی نقش بنایا ہم نے سب کے جی کو بھایا
کہاں ملے گا تم کو لوگو ایسا پھر نقاش

آنے والی نسلیں کہتیں ہم کو ایک پہیلی
پتھر پر تحریر انوکھی فکر کی ہوتے کاش

مشل فضائے خواب تھی جو شام بھول جا
جگنو تھا تیری راہ کا وہ نام بھول جا

گم نامیوں کے غار میں اب کاٹ زندگی
اک دن دیا تھا وقت نے انعام بھول جا

اس جہد میں تو فکرِ بر و بال چھوڑ دے
دانے کی سخت چاہ ہے تو دام بھول جا

اب حادثوں کی رات پہ گہری نگاہ رکھ
تجھ پہ جو مہربان تھے ایام بھول جا

اپنے کئے پہ اتنی پشیمانیاں بھی کیا
آئیں گے تیرے نام جو الزام بھول جا

یہ ناؤ تیرے گھاٹ سے بے کار ہے بندھی
لہروں پہ اس کو چھوڑ دے انجام بھول جا

فکری تجھے یہ درد ستائے گا عمر بھر
اک چیز جس کا نام ہے آرام بھول جا

پلٹ وہ آئے گا سُن کر تری دہائی کیا
ہجومِ صوت میں دے گا اسے سنائی کیا

ثبات رنگ وفا میں رہے تو بات بنے
رہے گی تازہ لہو کی یہ روشنائی کیا

ہوس کہوں یا اسے نام آرزو دے دوں
عجب سی چیز مرے دل میں یہ سمائی کیا

بڑا اُداس ہے لہجہ ترے تکلّم کا
کسی نے تجھ کو مِری داستاں سنائی کیا

شناوروں میں مجھے کیوں شمار کرتا ہے
جھپٹتی موج سے کشتی کبھی بچائی کیا

عبث جلائے ہیں اُمید کے دئیے تو نے
شبِ سیاہ سے پائے گا اب رہائی کیا

ابھی تو دن ہے اُجالوں سے کام لے فکری
رہِ مراد اندھیروں نے بھی دکھائی کیا

آتی جاتی لہریں گن کر اپنا جی بہلانا
پام کے پتے سایہ دیں گے بستی میں مت آنا

کس کو سکوں دیتے کب ہیں الٹا روگ لگاتے
خوابوں کے مت جال میں آنا ان سے آنکھ چُرانا

مٹنے کو ہر چیز جہاں کی لمحوں میں مٹ جائے
نرم سنہری ریت کے دل میں پھر بھی نقش اگانا

ایسی کون سی خوبی تجھ میں بخشے گا جو تجھ کو
سورج کا تو کام ہی ٹھہرا جلنا اور جلانا

ثابت ہو گی دشمن تیری آخر کو ہر خواہش
دشمن کو مت رستہ گھر کا بھولے سے دکھلانا

کتنا بوجھ اٹھایا ہم نے کیا کیا ٹھوکر کھائی
سُن کر یہ سب پہلے ہم سے اپنا حال سُنانا

فکر کی خوف سے تیرا بھی تو رنگ بگڑتا دیکھوں
کالی رات میں سننا مجھ سے بھوتوں کا افسانہ

رہتے ہیں سدا یاد ہمیں دن وہ سہانے
ملتے ہیں ہواؤں میں وہی گیت پرانے

خواہش کے دریچوں پہ گرے ضبط کے پردے
بہلائیں گے اب دل کو کسی اور بہانے

کچھ دیر تلک خواب سا آنکھوں میں رہے گا
آیا تھا ابھی چھت پہ کبوتر وہ اُڑانے

رنگوں سے چھلکتا ہوا بہکا ہوا موسم
آیا ہے ہمیں دیکھ تماشہ یہ بنانے

جنگل نہ ہمیں گھیر لے پھر چار طرف سے
نکلے ہیں اجالوں کو ذرا راہ دکھانے

فکر ہی اب اجازت کہ ہمیں دور ہے جانا
فرصت میں کبھی آئیں گے پھر ہنسنے ہنسانے

لیموؤں کے باغ کی بھینی مہک آنے لگی
بند کمروں کی ہوا بھی رنگ دکھلانے لگی

ان دنوں میں آئینے سے پوچھتا ہوں بارہا
کیوں اداسی کی گھٹا اس شکل پہ چھانے لگی

کس کے قدموں پر گرا تھا یاد کچھ آتا نہیں
اب تو زخموں کی کسک بھی چھوڑ کر جانے لگی

بیش قیمت گر نہیں تو اتنا ارزاں بھی نہیں
میرے یاروں کی سمجھ میں بات یہ آنے لگی

رفتہ رفتہ چڑھ رہا ہے اس پہ نشّہ عمر کا
اس کے ہونٹوں کی ہنسی اب شہد برسانے لگی

اس سکوتِ بے ریا سے آؤ فکری پوچھ لیں
کیوں صداؤں کی طلب پھر جی کو تڑپانے لگی

زمیں یہ آگ اگلنے لگے تو کیسا ہو
ہر ایک شہر جو جلنے لگے تو کیسا ہو

ملیں گی پھر نہ دُعائیں کسی کو جینے کی
ہوا جو تیغ سی چلنے لگے تو کیسا ہو

کٹیں گے کیسے کڑے کوس زندگانی کے
یقیں جو روپ بدلنے لگے تو کیسا ہو

تمام حرف رفاقت کے بے اثر ہونگے
دِلوں میں زہر جو پلنے لگے تو کیسا ہو

کرو گے کس کی ملامت بتاؤ تو فکریؔ
اگر وہ گر کے سنبھلنے لگے تو کیسا ہو

دشمنی کی اِس ہوا کو تیز ہونا چاہیئے
اس کی کشتی کو سرِ ساحل ڈبونا چاہیئے

چھین کر ساری اُمیدیں مجھ سے وہ کہتا ہے اب
کشتِ دل میں آرزو کا بیج بونا چاہیئے

اس سمندر کی کثافت آنکھ میں چبھنے لگی
اس کا چہرہ اور ہی پانی سے دھونا چاہیئے

سونپ جائیں اِن درختوں کو نشانی نام کی
ہم کبھی تھے اگلی رُت کو علم ہونا چاہیئے

یہ بھی کوئی تک ہوئی کہ کچھ ہوا تو رو پڑے
شخصیت کا رنگ فکری یوں نہ کھونا چاہیئے

رفتہ رفتہ سب مناظر کھو گئے اچھا ہوا
شور کرتے تھے پرندے سو گئے اچھا ہوا

کوئی آہٹ کوئی دستک کچھ نہیں کچھ بھی نہیں
بھولی بسری اک کہانی ہو گئے اچھا ہوا

ایک مدت سے ہمارے آئینے پہ گرد تھی
آنسوؤں کے سیل اس کو دھو گئے اچھا ہوا

بے کلی کوئی نہ تھی تو دل بڑا بے زار تھا
اب حوادث درد اس میں بو گئے اچھا ہوا

رنگ اپنا ہو نمایاں شوق بے جا تھا ہمیں
راستوں کی دھول میں ہم کھو گئے اچھا ہوا

بے سبب روتا تھا فکر ہی اور رلاتا تھا ہمیں
اب زمانہ ہو گیا اس کو گئے اچھا ہوا

وہ تو معصوم ہے چالاک بناؤ نہ اسے
بزمِ یاراں کی تقاریب میں لاؤ نہ اسے

گرمیِ لمس سے ہر رنگ اتر جاتا ہے
اس کو دیکھو ہی فقط ہاتھ لگاؤ نہ اسے

وہ جو سرسبز ہوا دیکھ کے بارش کا سماں
خشک صحرا کا کوئی حال سناؤ نہ اسے

وہ نہ سمجھے کہ کوئی تیر نہاں ہے اس میں
شعرِ سادہ کا وہ مفہوم بتاؤ نہ اسے

موجِ بے باک کی خواہش کا ٹھکانہ کیا ہے
سیرِ دریا کا کبھی شوق دلاؤ نہ اسے

چوٹ لگتی ہو رگِ سنگ پہ جس سے فکری
ایسے انداز مرے یار سکھاؤ نہ اسے

رات سڑکوں پر بھٹکنا لوٹنا گھر دیر سے
یہ وطیرہ تھا کبھی اب تو بہت ہی دن ہوئے

مات کھا کر منہ چھپاتا پھر رہا ہے ان دنوں
میرِ لشکر جو بنا تھا حال اس کا دیکھ لے

شہد کی خواہش اگر ہے حوصلہ کچھ تو دکھا
ہم تو ریچھوں کی قیادت میں گھنے جنگل گئے

دور تک تنہائیوں کا ساتھ تھا ہم نے دیا
دور تک ہم کو ملے تھے پربتوں کے سلسلے

ان دنوں کی یاد فکرؔی اب بھی ہم بھولے نہیں
لوگ سارے دیکھتے تھے ہم تماشہ تھے بنے

بھول لیے بھی وہ نظارے ان میں کیا رکھا ہے اب
موسمِ گُل جا چکا رنگِ جہاں بدلا ہے اب

راستوں کی دھول کیوں بے رنگ چہرے پر ملیں
گھر مقفل کر کے بیٹھیں ہم نے یہ سوچا ہے اب

بیچ ڈالیں یہ کتابیں خاک کر دیں یہ خطوط
بے صدا لفظوں سے آخر کون سا رشتہ ہے اب

سردیوں کی رات کے سارے الاؤ سرد ہیں
قصہ گو کی داستاں کا سلسلہ ٹوٹا ہے اب

رفتہ رفتہ یہ گلی کوئے ملامت بن گئی
اُجلا اُجلا دن یہاں آتے ہوئے ڈرتا ہے اب

جم کے برسے آج بادل زخم سارے دُھل گئے
شوخ رنگوں کی دھنک سے پھول آنکھوں میں کھلے

گنگناتی گاتی ندّی کو ذرا بس چھیڑنے
کشتیاں کاغذ کی لے کر غول بچوں کے چلے

ہم بھلا گہرائیوں میں ڈوب کر پاتے بھی کیا
جب کہ ساحل کے مناظر جان لیوا کم نہ تھے

سر پھری چنچل ہوائیں چھیڑ اب کس سے کریں
برف کے طوفان میں تو پیڑ ننگے ہو چکے

جانے دل میں کیا سمائی روشنی کو چھوڑ کر
ہم اندھیرے راستوں پر عمر بھر بھٹکا کیے

اس کہانی میں کہیں وہ موڑ آیا ہی نہیں
جس پہ رُک کر سننے والے اپنے اندر جھانکتے

چین سے سو جائیں فکریں اپنی پلکیں موند کر
جاگتے بھی گر رہے تو کیا ٹلیں گے حادثے

اک قہر مسلسل ہے اک خوف برابر اب
قاتل نظر آتے ہیں اس شہر کے تیور اب

یہ لفظ بچارے بھی مجبور ہوئے کتنے
شعروں میں نہیں ڈھلتے وہ خواب سے پیکر اب

بے آب بیاباں میں جاری ہے سفر اپنا
پیڑوں کے خنک سائے، دریا نہ سمندر اب

احساس ہزیمت سے جائیں گے کہاں بچ کر
مغرور ارادوں کے ہارے ہوئے لشکر اب

کٹ کٹ کے گریں جس پہ پھولوں سے لدی شاخیں
اس راہ سے روٹھے ہیں خوشبو کے پیمبر اب

سوچا ہے اُداسی کی بے رنگ فضا بدلیں
ہنسنے کی ادا سیکھیں اس شوخ سے مل کر اب

وہ حُسنِ طلب تیرا کیا خوب انوکھا تھا
ملتے ہیں کہاں فکریؔ تجھ سے وہ گداگر اب

خدا کی قسم اب تو ڈرتے ہیں ہم
کہاں اس گلی سے گذرتے ہیں ہم

پسِ پُشت ہوتی ہیں باتیں بہت
کوئی کام ایسا تو کرتے ہیں ہم

سیہ دُھند راتوں کو بڑھتی ہے جب
رگوں میں وہی آگ بھرتے ہیں ہم

بہاروں میں کھلتے ہیں ہم پھول سے
خزاں کی ہوائیں بکھرتے ہیں ہم

ہر اک پل نیا جنم لیتے ہوئے
ہر اک پل نئی موت مرتے ہیں ہم

پہنچتا ہے اڑکر اُسی بام پر
تخیل کے پر تو کترتے ہیں ہم

بلندی مُبارک ہو فکرِ تی تمہیں
نشیبوں کی تہہ میں اترتے ہیں ہم

بجھے ہیں جو چہرے انہیں تم نکھارو
اجالے کی کرنیں دلوں میں اتارو

تمہاری مسافت کے قصے چلیں گے
نقوشِ قدم کو لہو سے ابھارو

گھنے جنگلوں کی انوکھی فضا میں
درندوں کی دہشت سے چیخیں نہ مارو

نہیں قدر و قیمت سے عاری یہ باتیں
انھیں کچھ سجاؤ، انھیں کچھ سنوارو

بپھر یہ اٹھا تو کہاں بچ سکو گے
سمندر کو گھیرو نہ پیاسے کنارو

سوالوں سے آخر مفر کیوں نہیں ہے
اسی ایک الجھن میں عمریں گذارو

ہواؤں کے پُر شور ریلے میں فکرِ آخر
کہیں کھو نہ جاؤں مجھے تم پکارو

احساسِ زیاں چین سے سونے نہیں دیتا
رونا اگر چاہوں بھی تو رونے نہیں دیتا

ساحل کی نگاہوں میں کوئی درد ہے ایسا
موجوں کو مری ناؤ ڈبونے نہیں دیتا

کیا جانئے کس بات پہ دشمن ہوا موسم
سرسبز کسی شاخ کو ہونے نہیں دیتا

لرزاں ہے کسی خوف سے جو شام کا چہرہ
آنکھوں میں کوئی خواب پرونے نہیں دیتا

اک زہر سلگتا ہے رگِ جاں میں جو فکر ہے
اک پل بھی تری یاد میں کھونے نہیں دیتا

درختوں کے تلے کی دھوپ بکھرے آئینوں جیسی
گزرتی ساعتوں کی سانس لرزاں خوشبوؤں جیسی

ہوا سے چین لہروں سی مچلتی ہے جو رہ رہ کر
تو دل میں جاگ اٹھتی ہے کوئی تشنے خواہشوں جیسی

تری آنکھوں ترے بالوں میں آئے رنگ یہ کیسے
یہ نیلاہٹ فلک کی سی یہ سبزی جنگلوں جیسی

اجڑتے منظروں کے سوگ میں ڈوبے سبھی چہرے
فضاؤں سے برستی ہے اداسی آنسوؤں جیسی

شب گریہ بھی فکر تری روشنی کا اک تماشہ ہے
ابھی اشکوں میں دیکھو گے چمک تم جگنوؤں جیسی

ہوا جب سے رہنا مضافات میں
نہیں وہ تسلسل ملاقات میں

اُسے خط لکھے ایک مدت ہوئی
کہ کٹتے ہیں دن اب خرافات میں

نئے پہلوؤں کا تجسّس عبث
وہی بات نکلے گی ہر بات میں

کنارے کنارے نکلتے چلو
پھنسو گے وگرنہ تم آفات میں

جُدائی کا احساس ہلکا ہوا
غزل اُس نے مانگی ہے سوغات میں

گئے دن اُجالوں میں آتے نہیں
وہ آتے ہیں فکر کی سیہ رات میں

آئینے میں میرے جیسا یہ سمایا کون ہے
ساتھ ہر دم جو لگا ہے ایک سایا کون ہے

کس صدا پر جھومتے ہیں جنگلوں کے یہ شجر
آسماں بن کر سروں پہ سب کے چھایا کون ہے

رات کی گہرائیوں میں جب صدائیں گم ہوئیں
گونجتی ہے کس کی آہٹ، دیکھ آیا کون ہے

لڑکھڑاتی ہیں ہوائیں خوشبوؤں کے بوجھ سے
رنگ برنگے موسموں کے پھول لایا کون ہے

قاتلوں کو کامران و شادماں کس نے کیا
اِس سخاوت سے لہو جس نے لٹایا کون ہے

خوف بن کے ڈس رہا ہے کون فکری ذہن کو
تیرگی کی جھاڑیوں میں سرسرایا کون ہے

نیلگوں سی دُھند میں جاگی ہے پیڑوں کی قطار
بجھ گئے تاروں کے موتی ختم سارا انتظار

زور سے تالی بجا کر ہم اُڑائیں پھر اُنہیں
جھیل پہ اُتری ہے دیکھو پنچھیوں کی ایک ڈار

دھوپ کی ان نرم کرنوں کے سنہرے لمس سے
گم شدہ چہروں کے لمحے ہو رہے ہیں تابدار

جو نشیلی ساعتیں تھیں بے قراری کا سبب
ان کی یادیں کر نہ پائیں گی ہمیں اب بے قرار

یہ گذشتہ کرسمس کے کارڈ بے رونق ہوئے
جاتی خوشیوں کی پکاریں کر رہی ہیں سوگوار

جشنِ سالِ نو منا کر لوگ لوٹے شہر کو
پھر اُداسی کے حصاروں میں گھِرا وہ آبشار

اب تو فکر ہی یہ ہے برخزاں کی شام کا جادو ہوا
اس کو جا کر یہ بتا دے لے ہوائے مشکبار

آڑی ترچھی چند لکیریں دیواروں کی زینت
خالی خالی کمرہ سارا چھت سے ٹپکے وحشت

پتھر نیچے دب کر چیخے آوازوں کی روح
گھر کے سارے رہنے والے مٹی کی ہیں مورت

اجڑے اجڑے پیڑ بچارے گرم ہوا کا زور
سونی سونی گلیوں کی پھٹکار برستی صورت

قاتل کی تلوار سے ٹپکے نفرت بن کر خون
اس کی گردن کون دبوچے کس میں اتنی جرأت

لمبے لمبے کانوں والا کالا کالا اک آسیب
راتوں کو وہ آ کر پوچھے اکثر میری حالت

دھندلے دھندلے لگتے ہیں یہ چلتے پھرتے لوگ
رگ رگ میں اب دوڑ چلی ہے زہریلی سی لذت

رونا دھونا آہیں بھرنا فکر کی تجھ کو پیارا
ہنسنا گانا شور مچانا اپنی تو ہے عادت

ان پانیوں میں خوب نہانے کو جی کرے
سارے دکھوں کا بوجھ بھلانے کو جی کرے

آنکھیں جو سب کی کھول دے حیرتیں ڈال دے
ایسا کوئی سوانگ رچانے کو جی کرے

انجان سی صدائیں جو آتی ہیں دور سے
دیوانگی کے دشت میں جانے کو جی کرے

ان پربتوں کی چھاؤں میں سوئے سکوت کو
کرکے بلند چیخ ڈرانے کو جی کرے

بجھنے لگی ہے شام اندھیروں کی گود میں
ہر سمت ایک آگ لگانے کو جی کرے

وہ شخص جس سے روٹھ کے تنہا بہت ہوئے
اس کی گلی کی خاک اڑانے کو جی کرے

نکرہی یہ اختصار تو بے لطف سا رہا
قصہ کوئی طویل سنانے کو جی کرے

انتہا شوقِ فنا کی یہ بھی دکھلائیں گے ہم
تیرے قدموں کے تلے کی خاک بن جائیں گے ہم

لاکھ تو ہم کو مٹائے حرفِ نسیاں کی طرح
ایک دن ساری کتابوں میں پڑھے جائیں گے ہم

مثلِ خوشبو ہم کھلیں گے تیری سانسوں میں کبھی
بن کے آنسو تیری آنکھوں میں کبھی آئیں گے ہم

سرد صُبحوں کی نمی ہو یا روپہلی چاندنی
ان طلسموں کو بُھلا کر چین اب پائیں گے ہم

اجنبی شہروں کی یادیں اجنبی راہوں کی دھول
کس کی خاطر لوٹ کر سوغات یہ لائیں گے ہم

رنگ و بو کے سب فسانے خواب رفتہ ہو گئے
کن کھلونوں سے بتا اب جی کو بہلائیں گے ہم

پر شکستہ خواہشوں کے دام میں فکری پھنسے
عزم تھا کہ آسماں پہ ایک دن چھائیں گے ہم

رات وہ شہنائیوں والی کبھی جو آئے گی
پھول کھلنے کی مہک ہر سانس میں لہرائے گی

جھاڑیوں میں جگنوؤں کو جب پکڑنے جائیں گے
تیرگی میں اپنی پلکیں روشنی جھپکائے گی

گھومتے پھرتے وہی دن پھر کہاں سے آ گئے
آگ اب پیاری لگے گی دھوپ بھی شرمائے گی

گر کبھی بیٹھیں گے مل کر شام کی دہلیز پر
تلخیوں کو بھولنے کی آرزو کی جائے گی

جب پگھلتی ساعتوں میں خواب سے کُھل جائیں گے
انگلیوں میں ایک تتلی کانپتی رہ جائیگی

سُن رہا ہے آج فکر ہی شوق سے جس کو جہاں
ایک دن یہ داستاں بھی بے مزہ کہلائے گی

مجھے تو یوں بھی اسی راہ سے گذرنا تھا
دلِ تباہ کا کچھ تو علاج کرنا تھا

مری نوا سے تری نیند بھی سلگ اٹھتی
ذرا سا اِس میں شراروں کا رنگ بھرنا تھا

سلگتی ریت پہ یادوں کے نقش کیوں چھوڑے
تجھے بھی گہرے سمندر میں جب اترنا تھا

ملا نہ مجھ کو کسی سے خراج اشکوں میں
ہوا کے ہاتھوں مجھے اور کچھ بکھرنا تھا

اسی پہ داغ ہزیمت کے لگ گئے دیکھو
یقیں کی آگ سے جس شکل کو نکھرنا تھا

میں کھنڈروں میں اسے ڈھونڈتا پھرا لیکن
مگر کہاں تھا وہ آسیب جس سے ڈرنا تھا

ہنستی رُتوں کے سبز شجر خواب سے ہوئے
گرتے ہیں شاخ شاخ سے پتے جلے ہوئے

اُجڑا بدن تو اور کھُلے نقشِ ناتمام
بکھرا لہو تو تازہ کئی ولولے ہوئے

وہ بھی نگاہیں پھیر کے اب غیر بن گیا
ہم جیسے کوئی اور تھے اب دوسرے ہوئے

جن پہ لگے ہیں گھات میں آسیب تیرگی
مانوس اپنی ذات سے وہ راستے ہوئے

ان انگلیوں نے زہر کی پہچان سیکھ لی
سانپوں کے سر جسم کے بل کھولتے ہوئے

ہر راز اپنی جیب کا جن پر عیاں ہوا
ان دوستوں کے ہاتھ تھے کتنے منجھے ہوئے

پُر ہول دشت یاس کے گہرے سکوت میں
فکری تجھے بھی دیکھ لیں ہم ڈوبتے ہوئے

تیرہ و تار سمندر میں ڈبوئیں خود کو
یا مقابل کسی طوفان کے رکھیں خود کو

ہم نے جانا نہیں پرکھا نہیں اوروں کو کبھی
ہم سے کہتے ہیں مگر لوگ کہ پرکھیں خود کو

اپنی قیمت کا کچھ اندازہ ہمیں بھی ہوتا
ایسا بازار بتا وٗ جہاں بیچیں خود کو

وحشتیں ہم سے ہوئیں شوق کی ضد پہ اکثر
اب جو موسم ہے جدا بیٹھ کے سوچیں خود کو

اپنے چہرے کی لکیروں کا یہ ابہام کھُلے
اس کی آنکھوں کے اجالے میں جو دیکھیں خود کو

جن کی راہوں میں سیہ پیڑ جٹاؤں والے
کیسے محفوظ بلاؤں سے وہ سمجھیں خود کو

اپنے ہونے کا ابھی ہم کو گماں ہے فکری
گم جو ہو جائیں اندھیرے میں تو ڈھونڈیں خود کو

کسی کا نقش اندھیرے میں جب ابھر آیا
اداس چہرہ شب درد کا نکھر آیا

کھلے کواڑوں کے پیچھے چھپا تھا سناٹا
سفر سے ہارا مسافر جب اپنے گھر آیا

جو ڈھونڈے وہ اپنے شکستہ خوابوں کا
میں اس کی آنکھوں سے ایسے سوال کر آیا

وہ عکس عکس خیالوں کا آئینہ نکلا
مجھے وہ شخص اجالے میں جب نظر آیا

اکھڑتی سانسوں میں کیا تھا بتاؤں کیا فکری
یہی سمجھ لو کہ قصہ تمام کر آیا

ہوا جب سے ہونے لگی سبز فام
سلگتا ہے ہونٹوں پہ بس ایک نام

ندی میں مچلتی ہے رنگوں کی موج
کنارے کے پیڑوں پہ اتری ہے شام

جو راتوں کی نیندیں چرانے لگا
سمایا ہے سر میں وہ سودائے خام

کھلے آسمانوں میں اڑتے پھرے
پرندے نہ آئے کبھی زیرِ دام

چلو اب چلیں جنگلوں میں چلیں
ہوئے کام دنیا کے فکر تی تمام

دن مجھے ننگا کرے گا اور کیا
تہمتوں کے زخم دے گا اور کیا

ڈر گئے آسیب جس کی آنکھ سے
وہ کسی سے اب ڈرے گا اور کیا

میرے قصّے دشمنوں کے درمیاں
تو بھی ہنس ہنس کر کہے گا اور کیا

گر کبھی خالی ہوا دل کا مکاں
ایک سایہ آ بسے گا اور کیا

ساری گلیوں میں بہے گی تیرگی
خوف بہرے پر رہے گا اور کیا

اب کے دریا کی روانی تیز ہے
یہ کنارہ کچھ کٹے گا اور کیا

اِک سسکتی شام کا فکری لہو
ان چراغوں میں جلے گا اور کیا

سات سُروں کا باجہ لاؤں
باجے پر اک گیت سناؤں

جس پر اپنی غزلیں لکھّوں
اس کاغذ کی ناؤ بناؤں

ٹوٹ گئی وہ مورت جب سے
رو رو اپنی عمر بتاؤں

رشتے ناطے توڑ کے سارے
بستی بستی خاک اڑاؤں

لوگوں سے یارانہ کرکے
ان پر اپنا رنگ جماؤں

دشمن کو تلوار تھما کر
سارا پچھلا قرض چکاؤں

اتنا بس ارمان ہے فکریؔ
کھویا جو کچھ اس کو پاؤں

نشہ بن کے پلکوں پہ چھائے ہوا
کبھی شور کر کے جگائے ہوا

کبھی کھنڈروں میں سسکتی پھرے
کبھی نرم شاخوں میں گائے ہوا

کہیں تو جمائے تہیں برف کی
کہیں آگ بن کر جلائے ہوا

کہاں زور اس پر کسی کا چلے
جو چاہے وہی کر دکھائے ہوا

مچلتے ہیں شعلے اسے دیکھ کر
چراغوں کو لیکن ڈرائے ہوا

انھیں بھی مسرت کی خوشبو ملے
اگر بند گلیوں میں آئے ہوا

توجہ سے فکری اسے تم سنو
کہانی یگوں کی سنائے ہوا

شام کا کاجل گہرا ہوگا
سورج پھر یہ اندھا ہوگا

سائے جیسے لوگ ملیں گے
رستوں پہ سناٹا ہوگا

کھڑکی پہ وہ چہرہ رکھے
راہ کسی کی تکتا ہوگا

بیتے دن کی دھوپ میں اب بھی
اس کا رنگ دمکتا ہوگا

میرے ذکر پہ اس نے آخر
حال پتہ تو پوچھا ہوگا

جس کے شعر رُلائیں مجھ کو
جانے شخص وہ کیسا ہوگا

کتنی راتیں جاگ کے فکری
گہری نیند میں اُترا ہوگا

نہ ہو کچھ مگر کاش اتنا تو ہو
یہ رستہ کسی سمت جاتا تو ہو

ڈبو دیں گے خود کو بڑے شوق سے
سمندر بھی آنکھوں سا گہرا تو ہو

کہاں ساتھ دیتا ہے کوئی سدا
مگر ساتھ دینے کا وعدہ تو ہو

سرابوں کے دھوکے میں آئے وہی
ہمارے ہی جیسا جو پیاسا تو ہو

تجھے شاخِ صندل کی کیسے کہیں
کوئی سانپ تجھ سے بھی لپٹا تو ہو

پرندوں کے گیتوں کو ترسیں گے ہم
فضا میں خموشی کا نوحہ تو ہو

بنیں گے نئے خواب فکری مگر
اُجڑنے کا دل کے تماشا تو ہو

دلِ تنہا ترا ہر زخم ہرا تو ہوتا
سارے منظر میں کوئی رنگ نیا تو ہوتا

میں نے ہر بات سلیقے سے کہی ہے لیکن
میری باتوں کا ذرا ڈھنگ جُدا تو ہوتا

نقش ہوتا کہیں طوفان گذرنے کا اثر
اتنے پیڑوں میں کوئی پیڑ گِرا تو ہوتا

تیرہ رستوں پہ کوئی خوف لپکتا مجھ پر
سر بُریدہ وہی آسیب مِلا تو ہوتا

شب کے جنگل میں بھٹکنے سے بچاتا مجھ کو
گھر کی دہلیز پہ روشن وہ دِیا تو ہوتا

میں تو مجبور کہ پستی کو بلندی جانوں
تو پرندہ تھا بلندی پہ اُڑا تو ہوتا

جس میں ویران ہواؤں کی صدائیں بکھری
اپنے اندر کا وہ سناٹا سُنا تو ہوتا

سفر ہے ریگِ تپاں کا سراب مت دینا
نہ ڈھل سکیں جو حقیقت میں خواب مت دینا

ہماری آنکھیں تو یوں بھی سلگتی رہتی ہیں
کریں وہ آس تری یہ عذاب مت دینا

نہ رکھ سکے گا کوئی دور دستِ موسم سے
کسی کو اپنے بدن کا گلاب مت دینا

زباں کو اپنی سکھانا رموزِ خاموشی
کسی کو اپنے کیے کا حساب مت دینا

لکھے ہوں جس میں قصیدے اندھیری راتوں کے
سحر کے ہاتھوں میں ایسی کتاب مت دینا

دیے ہیں کس نے تجھے زخم آرزو فکر ہی
کبھی جو پوچھے کوئی تو جواب مت دینا

گزر گیا ہے وہ موسم جو خواب جیسا تھا
ہر ایک لمحہ دمکتے گلاب جیسا تھا

فلک کے نیل سے کھلتا تھا رنگ آنکھوں میں
ہوا کی سانسوں میں نشہ شراب جیسا تھا

طلب تھی جس کی بہت پیاس کے بیاباں میں
ہمیں وہ آبِ رواں بھی سراب جیسا تھا

سفر کی حدِ طوالت تو پھر بھی آساں تھی
بدن کا بوجھ ہی ہم پہ عذاب جیسا تھا

لگی ہیں جس کے لبوں پہ سکوت کی مہریں
کبھی وہ شخص کھلی اک کتاب جیسا تھا

کہاں سے ہوتے زمانے میں کامراں نکہتؔ
وجود اپنے یقیں کا حباب جیسا تھا

سبھی سفینوں کو طوفاں ڈبو گئے ہوں گے
ہوائے دشت کو بادل بھگو گئے ہوں گے

سکوں نواز اندھیروں میں ڈوبتے چہرے
سنہری آس کی چوکھٹ پہ سو گئے ہوں گے

جو روشنی کے جزیروں کو ڈھونڈنے نکلے
سمندروں کی سیاہی میں کھو گئے ہوں گے

سلونے رنگ جو موسم کے ساتھ آئے تھے
سہانے خواب دلوں میں سمو گئے ہوں گے

وہ پھول جن سے لپٹنے کو مر مٹے فکری
تمہاری روح میں کانٹے چبھو گئے ہونگے

سردئی شب میں شرر خیز فسانہ کوئی
اپنی آنکھوں میں رہے خواب سہانا کوئی

جس کو مدت ہوئی اغیار سے رشتہ جوڑے
اس کو احوال ہمارا نہ سنانا کوئی

یورشِ بادِ حوادث تجھے سہنی ہوگی
اپنے آنگن میں اگر پیڑ لگانا کوئی

نام آئے گا بہر حال ہمارا اس میں
جب بھی دہرائے گا قصہ تو پرانا کوئی

ہم سیاہی کو اگر پھر بھی سپیدی کہہ دیں
ہم پہ رکھے گا نہ الزام زمانہ کوئی

چار جانب وہی بے جان سپیدی کیوں ہے
میری ہر صبح کسی شام سے لپٹی کیوں ہے

جس کے رنگوں سے ابھرتا ہے خزاں کا موسم
دہی تصویر مری میز پہ رکھی کیوں ہے

سبز بیلیں ہیں جہاں سرخ چھتوں کے گھر ہیں
میری آنکھوں میں وہی خواب کی بستی کیوں ہے

سرد لمحوں کی اداسی کے گھنے کہرے میں
کوئی آواز کہیں پاس سسکتی کیوں ہے

جن پہ ہوتا ہے اُجالوں میں اندھیرے کا گماں
ایسے لوگوں میں ترا نام بھی فکری کیوں ہے

درخشاں جب ترا نقشِ صدا تھا
مری آنکھوں میں ہر منظر نیا تھا

در و دیوار پہ کیسے نشاں ہیں
یہاں کیا حادثہ کوئی ہوا تھا

عجب تھی شام وہ بھی بے کسی کی
گھنے جنگل میں سورج کھو گیا تھا

بہت آباد تھیں ویرانیاں بھی
کسی کے قرب کا جب آسرا تھا

مٹے آثار فکر ہی اس نگر کے
جہاں ہر شخص پتھر کا بنا تھا

تبسم لبوں پہ نہ لاؤ گے کب تک
یہ اشکوں کے موتی لٹاؤ گے کب تک

بڑی دور رس ہیں اجالوں کی آنکھیں
اندھیرے کو پردہ بناؤ گے کب تک

کسی دن تمہیں بھی ڈرائے گا کوئی
ہمیں پا کے تنہا ڈراؤ گے کب تک

سمیٹو گے کیسے غبار بدن کو
ہواؤں سے اس کو بچاؤ گے کبتک

بہر حال تم کو زمیں کھینچ لے گی
خلاؤں سے رشتہ نبھاؤ گے کبتک

نہیں کوئی آئے گا ملنے کو فکریؔ
ہر اک شام پلکیں بچھاؤ گے کبتک

تیرگی میں یاد بن کے جب بھی آ جاتا ہے تو
کیسے کیسے خواب آنکھوں کو دکھا جاتا ہے تو

میرے چہرے سے مٹا کر رات کے سارے نشاں
جھلملاتا آئینہ مجھ کو بنا جاتا ہے تو

اپنے ہونٹوں کی نمی سے آشنا کر کے مجھے
تشنگی کے دشت میں شبنم لٹا جاتا ہے تو

لوٹ جاتا ہوں گھنے پیڑوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں
جب فسانے عہدِ رفتہ کے سنا جاتا ہے تو

پر شکستہ میں اسیرِ حسرتِ پرواز ہوں
اور افق کی بے پناہی میں اڑا جاتا ہے تو

ہے زوالِ شام کی گھڑیوں میں فکری کو گماں
پھول نظروں میں ستاروں کے کھلا جاتا ہے تو

دکھوں سے قرب کا رشتہ نہ رکھنا
سفر کی راہ میں صحرا نہ رکھنا

رقابت پر اُتر آئے گی کالک
بدن اپنا بہت اُجلا نہ رکھنا

ڈبوئے گی تجھے موجوں کی چاہت
قدم اپنے سرِ دریا نہ رکھنا

نہ لکھنا کوئی بھی حرف و حکایت
ورق دل کا مگر سادہ نہ رکھنا

تری پہچان جو مبہم بنا دے
شریکِ جاں کوئی ایسا نہ رکھنا

ہے رستہ بے صدا سنسان لیکن
کسی آسیب کا دھڑکا نہ رکھنا

اسی میں منعکس ہوگا وہ فکری
یقیں کا آئینہ دھندلا نہ رکھنا

خود یہ کتنا ہنسے ہیں جب سوچا
پاؤں لکڑی کے خوف کانٹوں کا

شور کرتی ہیں آندھیاں لیکن
ختم ہوتا نہیں ہے سناٹا

کوئی آیا نہ دیکھنے اس کو
رات پیڑوں پہ چاند جب اترا

شب کی گہری سیاہ آنکھوں میں
ایک منظر ہے خواب کے جیسا

کان دیوار کے اگر ہوتے
راز ہوتے تمام ہی افشا

باغ سنسان تھا اندھیرے میں
چھپ کے پھولوں میں کوئی روتا تھا

ہم تو بجھنے پہ آگئے فکری
رُخ مخالف ہوا ہواؤں کا

شاخِ امید تھام کر دیکھیں
اس کے رستے میں شام کر دیکھیں

رنگ جتنے بھی ہیں اداسی کے
حُسنِ موسم کے نام کر دیکھیں

بھول جائیں بھی بے رُخی سب کی
جی کو سب کا غلام کر دیکھیں

درد شاید ہو اس طرح آساں
اپنے رازوں کو عام کر دیکھیں

جس سے رشتہ ہے بے زبانی کا
اس سے فکر ہی کلام کر دیکھیں

جھوٹی حقیقتوں کی طرح لوگ مر گئے
لیکن دلوں پہ نقش وہ تصویر کر گئے

سمجھیں گے اپنی عمر کا قصّہ تمام ہے
رنگِ خزاں کو دیکھ کے جس روز ڈر گئے

سب کو جلا کے راکھ ہوئی موسموں کی آگ
سب کو ڈبو کے دیکھئے دریا اتر گئے

چڑیوں نے جس پہ آس کے ڈیرے جمائے تھے
ننگی ہیں اس کی ڈالیاں پتّے بکھر گئے

فکر کی اندھیری شام سی یہ دوپہر مگر
نکلی ذرا سی دھوپ تو چہرے نکھر گئے

ہرے کھجور درختوں والے باغ میں آئی شام
پتوں پر سے مٹتا جائے دھوپ کا روشن نام

جاتے لمحو! جاتے جاتے کہہ دو اتنا جھوٹ
خوشبو بن کر ساتھ رہو گے ہر رستے ہر گام

پھولوں کی رنگین مہک میں ڈھونڈیں کس کا روپ
اور ہوا کے ہاتھوں بھیجیں کس کو ہم پیغام

رُکا رُکا سا آنکھ کا دریا ٹھنڈی جی کی آگ
پانی بھی تھک ہار گیا ہے شعلہ بھی ناکام

کھیل تماشہ لگتا ہو جب لوگوں کو ہر زخم
جذبہ بھی بے مول ہے اس میں آنسو بھی بے دام

زہر ملامت پھیکا فکری سنگ ملامت موم
ایسے میں بے لطف ہوئے ہیں ہم رسوا بدنام

نقش ان کے مٹا رہی ہے اب
شام رستوں پہ چھا رہی ہے اب

جو تمنا تھی شاخ پھولوں کی
مجھ میں کانٹے اُگا رہی ہے اب

رُت جو آئی تھی رت جگوں والی
کر کے تنہا وہ جا رہی ہے اب

بھر رہی تھی اُڑان جو چڑیا
چھپ کے پتوں میں گا رہی ہے اب

پہلے معصوم تھی خموشی بھی
کتنی باتیں بنا رہی ہے اب

سیل آفات کی صدا فکری
میری جانب بھی آ رہی ہے اب

(فسادات کے دنوں میں)

رُت بدلنے کی آرزو بھولو
پیڑ سہمے ہیں یہ سماں دیکھو

سبز جنگل نہ سبز گوں سائے
دھوپ دشمن ہے لوٹ بھی جاؤ

رنگ محفل سے ربط کا ہے کا
اب خموشی کا ساتھ ہے لوگو

جلتے جسموں کی آگ سے روشن
شب ترستی رہی اندھیرے کو

اپنی تعمیر تھی مٹا ڈالی
شہر ویراں ہوئے تو ہونے دو

جس پہ لکھا ہے سانحہ دل کا
وہ ورق اب کتاب کا پلٹو

ہم سے فکر تھی عداوتیں کیسی
تم ہو اپنے ذرا بتاؤ تو

نگاہوں میں روشن تھے مہتاب سے
وہ لمحے بھی نکلے فقط خواب سے

جنہیں دیکھ لگتا تھا اپنے ہیں وہ
ہوئے لوگ سارے وہ نایاب سے

کہاں جا کے موجیں بھی گم ہو گئیں
ہیں دریا خروشاں نہ پایاب سے

وہی مول مٹی کے سارے بکے
نکالے جو موتی تہِ آب سے

کرو تشنگی کا مداوا کوئی
تقاضا ہے ہونٹوں کا زہراب سے

اندھیروں کی آنکھیں بھی حیراں ہوئیں
لہکتے دنوں کی تب و تاب سے

چلو یہ تماشہ بھی فکری کریں
پکاریں گے ساحل کو گرداب سے

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

گذرے موسم پکارنے آجا
پھول شاخوں پہ وارنے آجا

اُجلے منظر پہ گرد ہے گہری
اس کی صورت نکھارنے آجا

روز و شب کے بدلتے رنگوں میں
خواب اُلجھے سنوارنے آجا

تو نے بخشے جو ہجر کے لمحے
بوجھ اُن کا اتارنے آجا

کب سے ویراں ہے آئینہ دل کا
عکس اس میں ابھارنے آجا

سبز پیڑوں کی چھاؤں میں نکھری
دن سہانے گذارنے آجا

(زکی انور کے نام)

اداس رات کی آنکھوں میں جو نمی سی ہے
الم اسیر خموشی بھی کچھ ڈری سی ہے

ورق وہ جس پہ ترا نام تھا جلا لیکن
چمک وہ تیرے لہو کی ابھی دبی سی ہے

یہ زخم تیرے کہ شاخوں پہ پھول کھلتے ہیں
یہ نقش تیرا کہ راہوں میں روشنی سی ہے

فصیل شہر پہ کس نے دیئے سجائے ہیں
درونِ شہر اندھیروں میں کھلبلی سی ہے

ہماری خاک کو کیسے یقین ہو فکریؔ
ہوائے تند کی وحشت میں کچھ کمی سی ہے

لہک وہ درختوں میں اب کے نہیں
پرندے بھی شاخوں پہ چہکے نہیں

میں کوتاہ دستی پہ روتا رہا
پکے پھل جو دامن میں ٹپکے نہیں

اندھیر دل میں روشن رہیں گے دیے
ہوا یا گلوں سی جو سنکے نہیں

بدن کے نمک کو گھلاتے رہے
وہ آنسو جو آنکھوں سے چھلکے نہیں

عجب طور راہ جُدائی کٹی
کہ یادوں کے جگنو بھی چمکے نہیں

کوئی ساتھ جیسے کہ چلتا رہا
قدم اس مسافت میں بہکے نہیں

کہ سب کچھ تو اپنی زباں سے کہے
یہ آداب فکرِ طلب کے نہیں

شبنم بھیگی گھاس پہ چلنا کتنا اچھا لگتا ہے
پاؤں تلے جو موتی بکھریں جھلمل رستہ لگتا ہے

جاڑے کی اس دھوپ نے دیکھو کیسا جادو پھیر دیا
بے حد سبز درختوں کا بھی رنگ سنہرا لگتا ہے

بھیڑیں اُجلی جھاگ کے جیسی سبزہ ایک سمندر سا
دور کھڑا وہ پربت نیلا خواب میں کھویا لگتا ہے

جس نے سب کی میل کثافت دھوئی اپنے ہاتھوں سے
دریا کتنا اُجلا ہے وہ شیشے جیسا لگتا ہے

پھولوں والا موسم شاید دستک دیکر لوٹ گیا
ہم نے اب جو کھڑکی کھولی سب کچھ پھیکا لگتا ہے

اندر باہر ایک خموشی ایک جلن بے چینی سی
کس کو ہم بتلائیں آخر یہ سب کیسا لگتا ہے

شام لہکتے جذبوں والی نکری کب کی راکھ ہوئی
چاند روپہلی کرنوں والا درد کا مارا لگتا ہے

دُکھ میں ڈوبی نوائے شب سنئے
جاں پگھلتی ہے کیوں سبب سنئے

دردمندی کی بھیک لوگوں سے
کیسے کرتے ہیں ہم طلب سنئے

سارے قدموں کے نقش کھو بیٹھی
ریگ ساحل بھی ہے عجب سنئے

سب کے ہونٹوں پہ بس وہی باتیں
کس کو فرصت کہاں ہے کب سنئے

لے اڑانوں میں کھو گئی فکریں
پر شکستہ صدائیں اب سنئے

آکر مجھے قریب سے پہچانئے کبھی
میں ہوں وہی کے اور ہوں یہ جانئے کبھی

آساں نہیں ہے ضبط کی حد بندیاں مگر
کھُل کھیلنا بھی سہل نہیں مانئے کبھی

مل کر بدن پہ دھوپ کی افشاں دکھائیے
اور خاکِ دشتِ تیرگی بھی چھانئے کبھی

آتی ہے موج درد سی اک بے نشاں صدا
خود پہ ردائے خواب اگر تانئے کبھی

فکری کبھی تو پیار کے دو بول بولئے
اپنوں میں میرا نام بھی گردانئے کبھی

چاندی جیسی جھلمل مچھلی پانی پگھلے نیلم سا
شاخیں جس پر جھکی ہوئی ہیں دریا بہتے سرگم سا

سورج روشن رستہ دے گا کالے گہرے جنگل میں
خوف اندھیری راتوں کا اب نقش ہولا ہے مدھم سا

درد نہ اُٹھّا کوئی دل میں لہو نہ ٹپکا آنکھوں سے
کہنے والا بجھا بجھا تھا قصہ بھی تھا مبہم سا

ہنستی گاتی سب تصویریں ساکت اور مبہوت ہوئیں
لگتا ہے اب شہر ہی سارا ایک پرانے البم سا

سرد اکیلا بستر فکریں نیند پہاڑوں پار کھڑی
گرم ہوا کا جھونکا ڈھونڈوں جی ہے گیلے موسم سا

عبث ہے تو اُسے اب ڈھونڈتا ہے
یہاں سے دور جب وہ جا چکا ہے

ستارے جیسے مدھم ہو گئے ہیں
تجھے کھویا تو کچھ ایسا لگا ہے

مسرّت کے شگوفے پھوٹتے ہیں
بڑی جاں بخش جنگل کی ہوا ہے

قدم جس پر نہیں رکھتا ہے کوئی
وہ رستہ گھر سے میرے آملا ہے

پہاڑوں پر چلا آیا ہوں فکری
خموشی میں یہاں ڈوبی فضا ہے

دور جنگل میں روشنی سی ہے
تیرہ دہشت میں کچھ کمی سی ہے

اس مسافت کی راہ میں تنہا
ایک بستی تھی وہ جلی سی ہے

جس نے بخشے تھے خواب آنکھوں کو
اس کی تصویر اب بجھی سی ہے

سب کو نہلا رہی ہے رنگوں میں
رت بہاروں کی سر پھری سی ہے

کوئی بھٹکے گا عمر بھر جس میں
دل کی حالت بھی اس گلی سی ہے

کس بلا کا سکوت ہے فکری
رات سہمی سی ہے ڈری سی ہے

اندھیری شب ہے مگر اس قدر اندھیرا کیوں
کھلا نہ مجھ پہ کسی آس کا دریچہ کیوں

پکار جس میں تھی شامل گئے زمانوں کی
صدا وہ کس کی تھی مڑ کر ذرا نہ دیکھا کیوں

کہاں یہ خاک بدن تشنگی پہ روتی ہے
امنڈتا رہتا ہے آنکھوں سے ایک دریا کیوں

سجاؤں یادوں کی محفل بلاؤں اس کو بھی
کیا ہے دل نے مرے مجھ سے یہ تقاضا کیوں

ملا نہ جس سے تعلق کو آسرا کوئی
بچھڑتے وقت اسی شخص نے رلایا کیوں

درودِ شام کی دیتا ہے جو خبر فکریؔ
بہت ہی تنہا سا لگتا ہے وہ ستارہ کیوں

سب کی نظروں سے دور جانے دے
رنج و راحت کے دن بھلانے دے

کیوں لبھاتے ہیں دور کے منظر
اس تماشے کا بھید پانے دے

سہل ہوگا سفر امیدوں کا
خواب آنکھوں میں کچھ سجانے دے

کوئی کونپل کہیں تو پھوٹے گی
رنگ موسم کے مسکرانے دے

ہم بھی لہکیں گے، خوب بہکیں گے
پھول شاخوں پہ اب کے آنے دے

کتنے دریاؤں سے گذر آئے
اب سمندر بھی آزمانے دے

شورِ گریہ تو تھم گیا فکری
جاں خموشی میں اب گھلانے دے

گلیوں میں سیہ رات کا جو سیل بہے گا
دہشت سے مری آنکھ کا ہر خواب مرے گا

رازوں بھری گمبھیر خموشی کا گھنا جال
ہنستے ہوئے اس شہر کو پھر صید کرے گا

چپ چاپ تو ہو جاؤں مگر خوف یہی ہے
تو مرگ صدا دیکھ کے مجھ سے ہی ڈرے گا

مجھ سے جو بچھڑتا ہے ابھی وقت کی صورت
چھُپ چھُپ کے وہی یاد کے پردوں میں رہیگا

بھٹکا ہوا بادل تھا بھگویا تجھے جس نے
اچھا ہے ترے جسم کا اب پھول کھلے گا

ابھرے گا پہاڑوں سے چمکتا ہوا سورج
اجڑے ہوئے منظر میں کئی رنگ بھرے گا

اکتا کے کسی دن یہ زمیں چھوڑ کے فکری
نظروں سے بہت دور کہیں اور بسے گا

ہم نے دنیا دیکھ ڈالی وہ نظر آیا نہیں
وہ بھی ہوتا جس سفر میں وہ سفر آیا نہیں

اس مسافت میں گھنے اشجار تو آئے مگر
روک لیتا جس کا سایا وہ شجر آیا نہیں

خاک ہوتی بستیاں ہم کو ملیں ہر راہ میں
خواب جس میں گھر بناتے وہ نگر آیا نہیں

کیا اسے بھی دوریوں نے بس میں اپنے کر لیا
کس سہارے ہم جئیں گے وہ اگر آیا نہیں

بس یہی اک بات فکریؔ دکھ ہمیں دیتی رہی
نقش پانی پر بنانے کا ہنر آیا نہیں

جو بھی ہے ترے پاس بکھرنے کو ہے سن لے
خوابوں کی ترے فصل بھی مرنے کو ہے سن لے

بدلے ہوئے موسم کی نگاہوں کے مقابل
پھولوں کا ترے رنگ اترنے کو ہے سن لے

کھو جائیں گی جبھیں ترے گیتوں کی صدائیں
ہر سمت وہی شور ابھرنے کو ہے سن لے

نظروں میں ہے آفات کی ہر چیز یہاں کی
اک سیل بلا خیز گذرنے کو ہے سن لے

کہتے ہیں تجھے غیر تو حیراں نہ ہو فکری
تجھ سے تو ترا عکس مکرنے کو ہے سن لے

سیہ بیلوں پہ سہمی پتّیاں ہیں
کہاں اب رنگتوں کی تتلیاں ہیں

گئے موسم کے ٹھنڈے آئینے میں
یہ کس کی یاد کی پرچھائیاں ہیں

چلو اِن کی تھکن کا حال پوچھیں
کنارے سے لگی جو کشتیاں ھیں

چراغوں کو ستائے خوف کس کا
ہوائیں ان دنوں جب مہرباں ہیں

منائیں آشیاں کی خیر فکری
گھٹاؤں میں ابھی کچھ بجلیاں ہیں

بعد مدت کے چاند دیکھا ہے
دل میں یادوں کا ایک میلہ ہے

لطف لیتے ہیں دیکھنے والے
میرا رونا بھی اک تماشا ہے

یوں تو اپنوں سا کچھ نہیں اس میں
پھر بھی غیروں میں وہ الگ سا ہے

میرے گھر میں پناہ کی خاطر
یہ اندھیرا کہاں سے آیا ہے

سارے موسم تو چکھ چکے فکری
اب بتاؤ کہ کیا ارادہ ہے

زخم چننا یا سرابوں کے سفر میں رہنا
عمر تھک جائے تو یادوں کے نگر میں رہنا

دن کے صحرا میں کسی خواب کی خاطر بھٹکیں
شب جو آئے تو بلاؤں کے اثر میں رہنا

یہ تو چاہا تھا اندھیروں سے چھڑائیں دامن
پر نہ چاہا تھا اجالوں کی نظر میں رہنا

اپنی آنکھوں میں چراغوں کی امیدیں لیکر
یہ بھی کرنا کہ ہواؤں کی ڈگر میں رہنا

تجھ سا نگری ہی کوئی ہوتا تو بتاتے اس کو
کیسا لگتا ہے عذابوں کے بھنور میں رہنا

سینے میں اک شور سا یہ گونجتا کیا ہے
خوابوں کا ہر رات کو یہ سلسلہ کیا ہے

چہرے پر یہ خامشی کے جال ہیں کیسے
کھل کر اک دن بول دے کہ چاہتا کیا ہے

مرنے والا مر گیا جب پیاس کے مارے
پانی کی پھر جستجو کا فائدہ کیا ہے

گھر کے اندر بے حسی کا رنگ ہے وہی
سورج آ کر کھڑکیوں سے جھانکتا کیا ہے

اپنے ہیں جو تیرے فکر ہی ان سے تو نہ بول
چپ چپ رہ کر اپنے اندر ڈھونڈتا کیا ہے

آئیں گے دو چار دن میں ڈالیوں پہ پھول
پھولنے کی بات کو وہ جائے گا پھر بھول

پتھر سی یہ خامشی ٹوٹے گی کیا خاک
جھاڑیوں میں جھینگروں کا شور ہے فضول

سورج کے زوال نے ہیں چھینے سارے رنگ
پگھلے پگھلے آئینے سا پانی ہے ملول

گلیاں ہے آباد جن سے چہرے وہ عجیب
آنکھیں اُن کی خوف زا ہیں بالوں میں ہے دھول

قافلے جب آتے نہیں سوئے ریگزار
اونٹوں کی پھر یاد میں کیوں گریاں ہے ببول

فکر تیرے نام کو بھی جانیں گے کیا لوگ
محنت ساری زندگی کی ہو گی کیا وصول

صداؤں کو جیسے کوئی کھا گیا ہے
اداسی میں ڈوبی یہ ساری فضا ہے

ابھی ضبط کرنے کا یارا ہے مجھکو
ابھی درد آنکھوں میں آکر رُکا ہے

فسانہ طرازی نہیں اس میں یارو
جو میں نے کہا ہے تمہی سے سنا ہے

بھٹکتی ہیں یادیں اُسی رہ گزر پر
کہ گذرے جدھر سے زمانہ ہوا ہے

جو رہتا ہے چھپ کر مرے آئینے میں
وہ تنہا سمجھ کر مجھے ٹوکتا ہے

ہوئے پھول پیلے اُمیدوں کے نگری
یہ موسم ہے کیسا، یہ کیسی ہوا ہے

جسم کی حد سے ذرا اور بھی آگے نکلو
قید رفتار سے آزاد ہواؤں میں اُڑو

ان مناظر میں بڑی جان سی پڑ جائے گی
سبز تاروں کو کرو، چاند کو نیلا کر دو

اک عجب رنگ ہے الفاظ کے سانچوں سے پرے
اس کے چہرے کو ذرا غور سے اک پل دیکھو

کل جو آئے گا کوئی راز وہ ایسا تو نہیں
آنکھ رکھتے ہو تو دیوار پہ لکھا پڑھ لو

ڈھونڈ پاؤ گے کبھی اور نہ گھر کا رستہ
جال پھیلے ہیں ہر اِک سمت نہ تنہا نکلو

باس مٹی میں ملے گی مری اک دن فکری
میں تمہارا ہوں مگر دور کا رشتہ رکھو

سلگتی دھوپ میں وہ پھول جل گیا ہوگا
کسی کی آنکھ کا کانٹا نکل گیا ہوگا

بڑے ہی غیظ سے جس نے تباہیاں لائیں
کرو یقین وہ طوفاں سنبھل گیا ہوگا

میں اپنے آپ کو پہچان جب نہیں سکتا
تو کیا عجیب کہ وہ بھی بدل گیا ہوگا

مرے چہار طرف شام کی فصیلیں ہیں
اب اُس کے شہر کا سورج بھی ڈھل گیا ہوگا

پسِ غبار سیہ روشنی کا چہرہ ہے
اسی بھرم میں وہ ناداں بہل گیا ہوگا

مری ہنسی پہ مرے یار یہ سمجھ بیٹھے
کڑا جو بوجھ تھا فکر کی یہ ٹل گیا ہوگا

سلگتے ہوئے بدن پہ کوئی راکھ ڈالتا
یا آگ کے حصار سے آ کر نکالتا

شیشے سا کرچیوں میں بکھرتا زمین پر
کوئی ہوا میں زور سے مجھ کو اُچھالتا

پہلی کرن پہ جاگتا چڑیوں کے ساتھ ساتھ
سورج کبھی جو آ کے مرا گھر اُجالتا

گر جانتا کہ موج کی نیت خراب ہے
جوتے بغل میں داب کے پگڑی سنبھالتا

دہشت تھی اس قدر کہ اُسے برف چھو گئی
فکر ہی وہ تیری بات کبھی یوں نہ ٹالتا

بارش

وقت گذرا تو کئی زخم لگا کر گذرا
میرے خوابوں کے سبھی رنگ اُڑا کر گذرا

جس کی آہٹ کو ترستی تھی لہو کی دھڑکن
کتنے چُپکے سے دبے پاؤں وہ آ کر گذرا

یہ زمیں شور کہ محروم تمنا ہی رہی
ابر باراں تو گھر اپنے لُٹا کر گذرا

اب بھی نیندوں میں ڈراتا ہے اندھیرا بکر
وہی طوفاں جو چراغوں کو بجھا کر گذرا

موسم شوق کو دیتا ہوں دعائیں فکری
مجھ کو لوگوں میں تماشہ جو بنا کر گذرا

بھلا کے اس کو بہت چین جی کو آئے گا
مگر وہ سانپ رگوں میں جو سرسرائے گا

بڑے غرور سے سورج چمک رہا ہے ابھی
ڈھلے جو دن تو یہی خون میں نہائے گا

گریں گے پھول اندھیرے میں آنسوؤں کی طرح
روش روش پہ اُداسی کا رنگ چھائے گا

گزرتی ریل کی چیخوں کو رات میں سن کر
سفر کا خوف بہت دیر تک ستائے گا

مرے فضول سے قصے کو وقت کا راوی
ہزاروں رنگ میں ہر دور کو سنائے گا

مٹا دیا ہے جسے موسموں کے پھیرے نے
کبھی تو یاد میں وہ عکس جھلملائے گا

میں ہو تو آؤں گا اس راہ سے مگر فکری
مرا وہ نقشِ قدم بھید کب چھپائے گا

اندھیرا ہے، چراغوں کو بجھا دیں
چمکتی دھوپ کی یادیں بھلا دیں

کہانی پھر سبھوں کو لطف دے گی
اسے کچھ اور بھی رنگیں بنا دیں

جہاں سے ہر صدا ناکام لوٹی
کہو تو ہم اسی در پہ صدا دیں

نکلتی ہیں کئی راہیں یہاں سے
تمہیں کس سمت کا بولو، پتا دیں

گریں گے رات کی شبنم کے موتی
ذرا اِن سبز شاخوں کو ہلا دیں

گزرتے ہیں یہ لمحے خامشی سے
مگر ایسے کہ نیندیں ہی اُڑا دیں

جلائیں گے یہ جی کو اور فکریں
یہ سوکھے پھول دریا میں بہا دیں

سب مناظر اک طلسمی رنگ لیکر آئے ہیں
گیت جن کے ہم نے تم نے، پنچھیوں نے گائے ہیں

خوشبوؤں کے راز داں ہیں نرم جھونکوں کے سفیر
جنگلوں سے پھول بھر کے دامنوں میں لائے ہیں

رات سے یہ مانگتے ہیں اوس کے قطروں کی بھیک
ننھے ننھے پیڑ اپنے ہاتھ جو پھیلائے ہیں

کاسنی کپڑے پہن کر جس کی رنگت کھل اٹھی
اسکی آنکھوں میں پرانے موسموں کے سائے ہیں

کیا سمجھ کے پتھروں سے داستاں کہتے رہے
گر کبھی سوچا ہے فکر آئی سوچ کے پچھتائے ہیں

شجرِ شام، سیہ فام، نوائے ماتم
ہر طرف نالہ کشی عام نوائے ماتم

لب پہ رہتی ہے دعا رنج سے رشتہ کر کے
سب کی صورت پہ ملے شام نوائے ماتم

اس کے گالوں میں دمکتا ہے گلابوں کا لہو
جس نے لکھی ہے مرے نام نوائے ماتم

تیرہ و تار کھنڈر شہر، بھٹکتی روحیں
سرِ اندیشہ ہر اک گام نوائے ماتم

بہرِ فریاد کوئی اور وسیلہ فکری
لفظ لاچار تو ناکام نوائے ماتم

زرد پیڑوں پہ شام ہے گریاں
جی اُداسی کے دشت میں حیراں

نیم روشن سیاہیاں ہر سو
اور ہوائیں سکوت پہ خنداں

ٹھہرے پانی کے سرد شیشے میں
گزرے موسم کے عکس ہیں لرزاں

سب کے ہونٹوں پہ جم گئیں باتیں
سب کی آنکھوں میں رات نوحہ خواں

ربط رشتوں کے رنگ ہیں پھیکے
خواب قصے کہانیاں بے جاں

جانے کیسا وہ عشق ہوتا ہے
جس کو ملتی ہے منزلِ جاناں

جو تھا رستے کی روشنی فکر کی
وہ بھی نظروں سے ہو گیا پنہاں

جس کا بدن گلاب تھا وہ یار بھی نہیں
اب کے برس بہار کے آثار بھی نہیں

پیڑوں پہ اب بھی چھائی ہیں ٹھنڈی اداسیاں
امکانِ جشنِ رنگ کا اس بار بھی نہیں

دریا کے التفات سے اتنا ہی بس ہوا
تشنہ نہیں ہیں ہونٹ تو سرشار بھی نہیں

راہوں کے پیچ و خم بھی اسے دیکھنے کا شوق
چلنے کو تیز دھوپ میں تیار بھی نہیں

بچھڑے ہوؤں کی یاد نبھاتے ہیں جان کر
ورنہ کسی کو بھولنا دشوار بھی نہیں

جتنا ستم شعار ہے یہ دل یہ اپنا دل
اتنے ستم شعار تو اغیار بھی نہیں

اہلِ ہنر کے باب میں اس کا بھی ذکر ہو
نکہتؔ کو ایسی بات پہ اصرار بھی نہیں

چاند کچھ دیر درختوں پہ رُکے گا شاید
جاتے جاتے وہ کوئی راز کہے گا شاید

میرے سینے میں رہے یاد کی خوشبو محفوظ
اس بہانے وہ سدا پاس رہے گا شاید

جسم کی خاک اندھیروں کے حوالے کر دے
پھر اسی خاک سے شعلہ بھی اٹھے گا شاید

کان دیتے نہیں چالاک ہیں سو نیوالے
کوئی دروازہ کہیں اب کھلے گا شاید

میرے قدموں کے نشاں ڈھونڈ کے آ جا نگری
میں تو سایا ہوں مری چیخ سنے گا شاید

علی گڑھ اکتوبر ۸۷ء کے نام)

سیاہی دشت کی، تنہائیاں ہیں
یہاں تو خوف کی پرچھائیاں ہیں

لبوں پہ خامشی جلتی ہوئی سی
دلوں میں زخم کی گہرائیاں ہیں

نمی ہے آنسوؤں کی بادلوں میں
سسکتی راکھ سی پُروائیاں ہیں

اندھیرے کو ملی ہے کامرانی
چراغوں کے لئے رسوائیاں ہیں

وہی غم خوار ہیں فکری ہمارے
وہی اُن کی ستم آرائیاں ہیں

جب اندھیرے میں چین پاؤں میں
کیوں چراغوں سے لو لگاؤں میں

وہ تو خوش ہے سراب کو پاکر
جان اپنی عبث جلاؤں میں

اس سے مانگوں جو بھیک مرہم کی
اپنے زخموں کا جی دُکھاؤں میں

یوں بھی دیکھوں تباہیاں اپنی
رُخ پہ طوفاں کے گھر بناؤں میں

کتنا پیارا ہے ساحلی منظر
کیسے پانی میں ڈوب جاؤں میں

گرد بر تیں جما گئی فکر کی
رنگ کتنے تھے کیا بتاؤں میں

گلابی پھول کھلتے دھوپ ہوتی
کسی کی یاد آنکھوں کو بھگوتی

اسے ہم آنسوؤں کی بھینٹ دیتے
گلے مل کر کبھی جو شام روتی

نہ اٹھتی دل میں کوئی موج ایسی
ہمیں سرشاریوں میں جو ڈبوتی

ہماری ہی طرح یہ عارضی ہیں
لرزتی گھاس پہ شبنم کے موتی

اسی رُت کو ترستی ہیں نگاہیں
نئی اک فصل جو خوابوں کی بوتی

اثر رکھتی نہ فکر کی بات تیری
ذرا بھی سادگی اپنی جو کھوتی

دھوپ چمکی اگر نظاروں پر
کوئی احساں نہیں ہے آنکھوں پر

رنگ و خوشبو نہ دے سکے اب کے
سر جھکائے ہیں پھول شاخوں پر

برف پگھلے گی، اب نہیں ممکن
آگ روشن ہو کن امیدوں پر

کوئی طوفاں نہیں ہے دریا میں
میری کشتی نہیں جو موجوں پر

میرے غم کی حکایتیں سُن لے
تجھ سے ملنا ہوا ہے برسوں پر

پھر وہی شام ہے اداسی کی
پھر پتنگے گرے چراغوں پر

گھاس تنہائی کی اُگی نکلی
در پہ، دیوار پر منڈیروں پر

سرسبز ہوئی شاخِ نوا اپنی سناؤں
جو دل میں مرے درد ہے گیتوں میں چھپاؤں

میں کس کے تعلق سے ہوں قیدِ مکاں میں
گلیوں کی اداسی سے کہاں بھاگ کے جاؤں

اندر کے اندھیرے میں کبھی دھوپ نہ اُترے
باہر کے اجالے کی چمک دیکھ نہ پاؤں

ہنستے ہیں مرے زخم تری چارہ گری پر
تو کتنا ہے معصوم تجھے کیسے بتاؤں

کیوں چیختے رنگوں کی صدا در سے آئے
جب ہجر زدہ شام کی تصویر بناؤں

ہو گا نہ ترے شہر میں پھر کوئی تماشا
موسم کے تقاضوں سے اگر جان چُراؤں

لوٹوں گا اسی راہ سے کچھ دیر میں فکری
لمحوں کے بچھڑنے کا سماں دیکھ تو آؤں

خموشی کے حصاروں میں گھری ہر رات ہے میری
دُکھوں کے دشت میں حیراں اکیلی ذات ہے میری

لچک سرسبز شاخوں کی نہ بھیگے تن درختوں کے
سلگتی دھوپ آنکھوں میں یہی برسات ہے میری

نیا کچھ بھی نہیں ہوتا نہ امکاں اور ہونے کا
پرانی چند یادوں پر گزر اوقات ہے میری

کرو جس رنگ میں چاہو مری تفسیر تم یارو
نہیں کوئی پہیلی میں کھلی ہر بات ہے میری

بہت اس کھیل سے فکری لگائی آس تھی لیکن
مگر یہ جانتا کب تھا کہ لکھّی مات ہے میری

تو ہمارے ساتھ ہوتا دن سہانے دیکھتے
جو لٹاتی ہیں بہاریں وہ خزانے دیکھتے

اپنے زخموں کے لہو پر ہم نہ روتے چیختے
اپنے تیروں کے اگر ہم بھی نشانے دیکھتے

تیرے وعدوں کی گلی میں نامرادی جھیل کر
بے وفائی کے سبھی حیلے بہانے دیکھتے

تیری آنکھوں میں بسا ہے اگلی رُت کا انتظار
ہم تڑپتے ہیں وہی منظر پُرانے دیکھتے

اک بلائے جاں ہے فکر آتی یہ انوکھی آرزو
ہم بنیں کردار جن کے وہ فسانے دیکھتے

سوچیں تو یہ صحرا بھی سمندر بھی نہیں کچھ
اس دل کی تسلی کو ترا در بھی نہیں کچھ

اے گردشِ حالات ترے جبر کے آگے
شیشے کی کہاں خیر کہ پتھر بھی نہیں کچھ

کرتے ہیں سخن پھر بھی یہ احساس ہمیں ہے
الفاظ تہی رنگ ہیں اندر بھی نہیں کچھ

ڈھونڈیں کہاں اس عمر میں جینے کے بہانے
جب حُسنِ جنوں خیز کے پیکر بھی نہیں کچھ

ٹھکرا کے کسی دن یہ دل و جاں کے تقاضے
مرنے کو تو مر جائیں پہ مر کر بھی نہیں کچھ

تو اپنی عداوت کی سپر ڈال دے فکریؔ
جب میرے مقابل ترے لشکر بھی نہیں کچھ

ہر دم ہمیں یہ خوف وہی بات پھر نہ ہو
گرچہ کڑی ہے دھوپ مگر رات پھر نہ ہو

جن سے بنام قرب ملیں دوریاں ہمیں
ان دوستوں سے اپنی ملاقات پھر نہ ہو

خنکے ہیں گی بارشیں امڈیگا سیلِ اشک
مانگیں یہی دعائیں کہ برسات پھر نہ ہو

پچھلی رتوں کے زخم تو رستے ہیں آج بھی
رنگوں کی اس بہار میں بہتات پھر نہ ہو

ملنے لگی ہواؤں میں طوفان کی صدا
بدلی ہوئی سی صورت حالات پھر نہ ہو

نکر آئی وہ مہرباں تو ہوا ان دنوں مگر
اس کی گرہ میں زہر کی سوغات پھر نہ ہو

دُھلے دُھلائے کپڑے پہنیں نکلیں سب کے سات
تہوارہ کر اور جلیں گے بھولیں کل کی بات

مٹی کی دیواریں اس کی مٹی کی بُنیاد
اب کے یہ گھر بیٹھ نہ جائے آئی ہے برسات

جس کی خاطر خواب سجائیں وہ ہے اجلی بھور
جس کے ڈر سے نیند نہ آئے وہ ہے کالی رات

ہاتھ پساریں کس کے آگے مانگیں کس سے بھیک
کس کے در پر صدا لگائیں بابا کچھ خیرات

باغوں کا جب روپ نکھارے مدھر منوہر دھوپ
ڈالی ڈالی آئے چہکنے چڑیوں کی بارات

اُمس بھری اس بستی کو ہے کھلی ہوا سے بیر
کھُلے بنوں سے لاتی ہے جو ٹھنڈک کی سوغات

رستے کا اک پیڑ بلائے فکر ہی اپنے پاس
ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں ہے جس کی چکنے جس کے پات

کسی کے دل میں ہمارا بھی گھر اگر ہوتا
ہرا بھرا سا نگاہوں میں ہر شجر ہوتا

شریکِ راہ کی صورت میں ساتھ تم ہوتے
اُجاڑ شب کے اندھیرے میں جب سفر ہوتا

جہاں مکانوں کے اندر بھی چاندنی بستی
دیارِ خواب کی سرحد پہ وہ نگر ہوتا

خزاں کے دشت میں خوشبو کی آہٹیں ملتیں
تمہارے قرب کی یادوں میں وہ اثر ہوتا

اُداس لہجے کی ہم بھی کہانیاں کہتے
مقامِ درد سے اپنا بھی جب گذر ہوتا

کہاں نصیب میں فرصت کے وہ زمانے تھے
کہ سارا وقت شناساؤں میں بسر ہوتا

بھلے ہی اشک ہمارے نہ پونچھتا فکری
ہمارے حال سے لیکن نہ بے خبر ہوتا

جو قربتوں نے زخم دیئے بھول جانے دے
تنہائیوں کا جشن بھی جی کو منانے دے

دائم رہے گی ریت ہی اس کے نصیب میں
دریا کو موج موج میں طوفاں اٹھانے دے

شامِ فراق و ہجر کی باتیں تو ہو چکیں
قصہ شبِ وصال کا مجھ کو سنانے دے

آؤں کبھی تو لوٹ کے تیری پناہ میں
ترکِ سفر کے واسطے ایسے بہانے دے

عُریانیوں کا خوف ہے دن کی نگاہ سے
فکریؔ اندھیری رات کے پردے گرانے دے

پہاڑوں سے اترتی شام کی بے چارگی دیکھیں
درختوں پر لرز کر بجھ رہی ہیں آخری کرنیں

بہت ہی سرد ہے اب کے دیارِ شوق کا موسم
چلو گزرے دنوں کی راکھ میں چنگاریاں ڈھونڈیں

بھلا پتھر بھی رِستے ہیں کبھی شیشے کے زخموں سے
اگر ہوتا ہے ایسا تو حسابِ دوستاں کھولیں

سوادِ شام میں ڈھونڈیں کوئی مانوس سا چہرہ
ہوا کی رہ گزر پہ ایک ننھا سا دیا رکھیں

کہاں الفاظ دیتے ہیں ہمارا ساتھ اب فکری
کہے اشعار سب بے جاں ہوئیں بیکار سب غزلیں

سلگتی آنکھ سے دریا بہایا
تماشہ یہ بھی ہم نے کر دکھایا

عجب بے گانگی تھی اُس بدن میں
کلیجے سے جسے ہم نے لگایا

گھلائے گا ہمیں پھر آنسوؤں میں
ابھی جس درد نے پتھر بنایا

ہوئے ہم شہر میں پابند اتنے
کہ سر میں دشت کا سودا سمایا

سسکتی شام جیسے پوچھتی ہے
چمکتا دن بتا کس نے بجھایا

سہانے خواب کا بس ایک لمحہ
ہماری نیند کے حصے میں آیا

یہیں تنہائیاں فکری ملیں گی
یہاں ہر شخص لگتا ہے پرایا

خموشی کہیں پاس رونے لگی ہے
لڑی آنسوؤں کی پرونے لگی ہے

اداسی میں لپٹی ہوئی شام آکر
اداسی میں سب کو ڈبونے لگی ہے

گریزاں ہیں سائے سیہ راستوں سے
ہر اک شے اندھیرے میں کھونے لگی ہے

جلایا تھا سورج نے جن منظروں کو
انہیں سرد بارش بھگونے لگی ہے

ملے جس سے پھولوں کے نازک دلاسے
وہی شاخ کانٹے چبھونے لگی ہے

کھلی دھوپ جیسی یہ رُت آرزو کی
نئی فصل خوابوں کی بونے لگی ہے

کناروں سے فکری اٹھا شور ایسا
سمندر میں ہل چل سی ہونے لگی ہے

رنگ پیڑوں سے اُڑ گیا کیسے
دن گذاروں گا اب بتا کیسے

کیوں نکلتی نہیں اسیری سے
چپ کی مٹھّی میں ہے صدا کیسے

جس کہانی میں ذکر میرا تھا
تو نے اُس کو بھُلا دیا کیسے

غیر بستی تھی اجنبی گلیاں
بھول جاتا نہ راستہ کیسے

میرے پھولوں کو خاک ہونا تھا
تیز ہوتی نہ پھر ہوا کیسے

اپنی عریانیاں کسے سُونپوں
یہ بتائے گا آئینہ کیسے

تیری یادیں ہیں ہم سفر فکر ہی
تجھ کو سمجھوں میں گم شدہ کیسے

اپنے دکھ ہیں سمندروں جیسے
ہم ہیں کمزور کشتیوں جیسے

وہ بھی داغوں سے ہوگئے دھندلے
لوگ جتنے تھے آئینوں جیسے

گم ہوئے تیرگی کے ریلے میں
خواب اپنے تھے جگنوؤں جیسے

ہم بھی ثابت ہوئے پہیلی اب
تم بھی نکلے بجھارتوں جیسے

خواہشیں بھی اڑان بھرتی ہیں
پنکھ اُن کے بھی پنچھیوں جیسے

گھر کی چوکھٹ بھی غیر لگتی ہے
ہم جو رہتے ہیں بے گھروں جیسے

ہر سہارا ہے نارسا فکری
سب سہارے ہیں دوریوں جیسے

دن نکلنے کا سماں دیکھے زمانہ ہو گیا
دھوپ دریا میں رواں دیکھے زمانہ ہو گیا

رنگ بھرتا سا بدن میں خواہشوں کو چھیڑتا
وہ چہکتا آسماں دیکھے زمانہ ہو گیا

شام آتی ہے مگر سرگوشیاں کرتی نہیں
رات کو جادو بیاں دیکھے زمانہ ہو گیا

سبز پیڑوں سے گھری ننھے جزیروں کی طرح
خواب جیسی بستیاں دیکھے زمانہ ہو گیا

بھولی بسری ایک خوشبو دور کی آواز تو
تجھ کو یار مہرباں دیکھے زمانہ ہو گیا

بولتی تھیں جس کی آنکھیں ہونٹ رہتے تھے خموش
اس کو اپنے درمیاں دیکھے زمانہ ہو گیا

عشق والے لوگ فکری اب ہمیں ملتے نہیں
سرد آہوں کا دھواں دیکھے زمانہ ہو گیا

ہرے جنگلوں نے بلایا مجھے
بھٹکنے کا رستہ دکھایا مجھے

دعا میری سرسبز ہونے لگی
ہواؤں نے آ کر سُنایا مجھے

درختوں پہ پتوں کی پوشاک تھی
خزاں کی رُتوں نے بتایا مجھے

مرے جگنوؤں سے چمک چھین کر
اندھیروں نے بے حد ڈرایا مجھے

پلک موندنے کی سزا یہ ملی
کہ لوگوں نے دل سے بُھلایا مجھے

اترتے نشے کی تھکی موج نے
دُکھوں کی زمیں پر بہایا مجھے

یہ سب کچھ ہے فکریؔ اسی کا کرم
تماشا اسی نے بنایا مجھے

میری غزلوں کو ایک خوبصورت کتاب کی شکل میں پیش کرنے کا سارا عمل میرے عزیز رضاء المرتضی نے انجام دیا ہے۔ رضاء المرتضی نہ صرف فن طباعت کے ماہرین میں سے ہیں، وہ خود بھی ایک نہایت عمدہ شاعر، ایک اچھے افسانہ نویس اور ایک صاحب طرز انشائیہ نگار ہیں۔ لیکن ان کی زندگی کی دوسری اور بے حد ضروری مصروفیتیں انہیں ان کی طبیعت کے اصلی میلان یعنی ادب کو پورا وقت دینے میں حارج رہتی ہیں۔ مگر میں اس بات پر پورا یقین رکھتا ہوں کہ کسی نہ کسی دن وہ اس دشت کی سیاحی ضرور اختیار کریں گے اور وہ دن اردو کے تخلیقی ادب کے لئے نیک فال ہو گا۔

پرکاش فکری

پرکاش فکریؔ کی شاعری تقریباً نصف صدی پر محیط ہے۔ ان تمام سالوں میں نہ وقت نے بغیر اُنکی شاعری کا ہاتھ تھامے سفر کیا ہے، نہ ہی زمانے نے بنا اُن کے اشعار کو آغوش میں لئے کروٹ لی ہے۔

اُنکی شاعری میں خواب جاگتے ہیں اور صُبحیں ٹھہر جاتی ہیں۔ پہلی نظر میں ہی ایک ایسی ملائمت کا احساس ہوتا ہے جیسے ایک سوئے ہوئے نوزائیدہ بچے کے چہرے پر مسکراہٹ۔

پرکاش فکریؔ کی شاعری سے سرسری گزر جانے والوں کو اس جہانِ دیگر کا پتہ نہیں چلتا جو اس کی تہوں میں پوشیدہ ہے، نہ اُن گہرائیوں کا علم ہوتا ہے جن پر الفاظ کی سادگی نے پردے ڈال رکھے ہیں۔ مگر ذرا سا غور و فکر اور گنجینۂ معنی کا طلسم انہیں اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔